February
2022

جدید ترادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

یومِ یکجہتی کشمیر

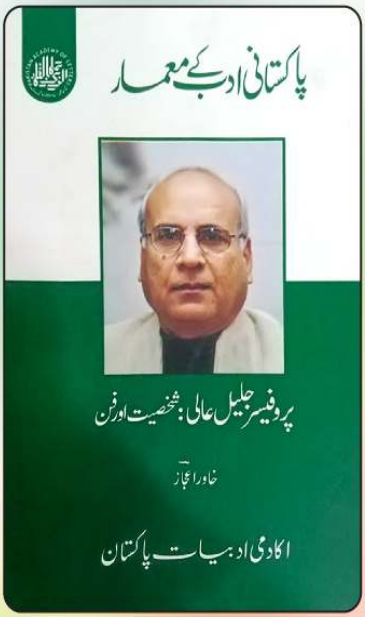

تقاریظ و مضامینِ حمد و نعت
تنقید
نسیمِ سحر

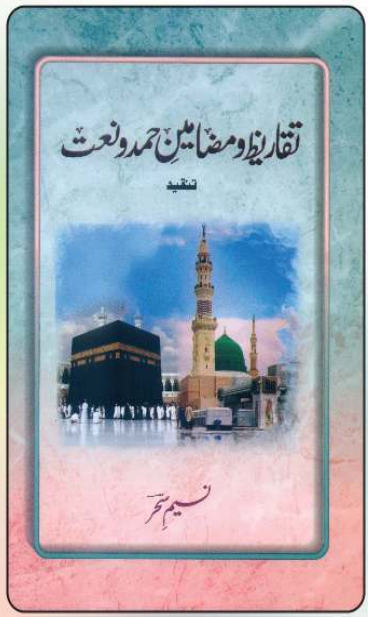

پاکستانی ادب کے معمار
پروفیسر جلیل عالی : شخصیت اور فن
خاور اعجاز
اکادمی ادبیات پاکستان

اِتصال
اکرم جاذب

غزل انتخاب 2021
غزل دستار
اصنافِ سخن سب خوب سہی
ہے زیبِ سخن دستارِ غزل
تالیف
گل بخشالوی

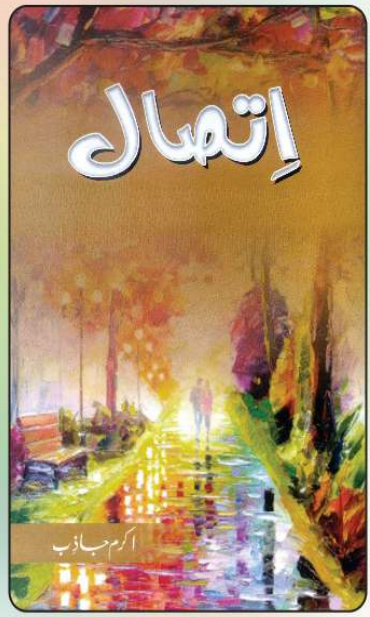

غزل

منظر تھے دھیان میں لبِ جُو کس دیار کے
آنکھوں میں تیرنے لگے بجرے خمار کے

دریا کی طرح ، خاک پہ خم ہے جبیں مگر
مجھ میں گھلے ہیں اَوج کسی کوہسار کے

کیوں بے کسی سے دیکھ رہے ہو فلک کی سمت
رستے نجات کے نہیں رستے فرار کے

جب سے ملا ہے غم کو غرُورِ سخن وری
کھُلنے لگے ہیں رنگ مرے انکسار کے

رُوحیں بدن میں عکسِ مجرّ کی طرح تھیں
چہروں کے نقش حرف تھے لَوحِ مزار کے

خالد چلا وہ مجھ کو سنا کر مِری غَزل
خود میری رُوح میں مرا خنجر اتار کے

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 30 - فروری 2022 - شمارہ نمبر: 2

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران - حاذق اسد
کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: یومِ یکجہتی کشمیر
قیمت: 100 روپے

سالانہ زرِ اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

www.trackntie.com
BAYAZ
ویب سائٹ برائے مطالعہ

عمران منظور ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر ملتان روڈ نزد سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	حسن عسکری کاظمی، بشیر رزمی، رخشندہ نوید	7 تا 9
2	نعت	محمد یٰسین قمر، خاور اعجاز، عقیل رحمانی، افتخار شاہد، اکرم ناصر سرور حسین نقشبندی، مظہر حسین مظہر، طلحہ غفور، علی آرش	10 تا 18
3	عقیدت	آصف ثاقب، سید ریاض حسین زیدی، مرزا آصف رسول	19 تا 22
4	رباعیات	خالد علیم	23
5	تصوف	سلیمان عبداللہ ڈار	24 تا 28
6	افسانے	بشریٰ رحمٰن، حبیب الرحمٰن، نجم رضوی، مرزا صہیب اکرام	29 تا 45
7	مائیکرو فکشن	سیدہ آیت گیلانی، نوین روما	46 تا 48
8	آبیتی	شوکت علی شاہ	49 تا 57
9	گفتگو	محترمہ قراۃ العین حیدر [حامد یزدانی]	58 تا 65
10	مضامین	جمیل یوسف، شاعر علی شاعر، عامر رضوی	66 تا 79
11	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، انور شعور، امجد اسلام امجد، جلیل عالی، جمیل یوسف، محسن اسرار، حسن عسکری کاظمی، نسیم سحر، رشید آفرین، سید ریاض حسین زیدی، احمد جلیل، سید قاسم جلال، گلزار بخاری، صفدر صدیق رضی، باقی احمد پوری، خاور اعجاز، طارق بٹ، غلام حسین ساجد، اعجاز کنور راجہ، حسن عباس رضا، یعقوب پرواز، علی اصغر عباس، منظور ثاقب، ممتاز راشد لاہوری	80 تا 184

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
11	غزلیں	حامد یزدانی، راحت سرحدی، احمد حسین مجاہد، واجد امیر جمشید چشتی، شاہین عباس، اقبال سروبہ، شفیق آصف، اکرم کنجاہی ریاض رومانی، حسنین سحر، شہاب صفدر، خورشید ربانی، اشرف کمال صغیر احمد صغیر، رمزی آثم، اسحاق وردگ، سعدیہ بشیر رخشندہ نوید، شہزاد احمد شیخ، آفتاب خان، اکرم ناصر، محمود راشد سعید راجا، شاہد مالکی، دانش عزیز، فرخندہ شمیم، محمد حفیظ اللہ بادل اعجاز روشن، طالب انصاری، شوکت محمود شوکت، جاوید صدیق بھٹی نوشابہ ہاشمی، عاطر عثمانی، تصور اقبال، سید مقبول حسین رضا اللہ حیدر، عقیل رحمانی، علی حسین عابدی، افتخار شاہد محمود کیفی، انصر حسن، بشیر احمد حبیب، ثمینہ سید، طلعت شبیر طاہر ناصر علی، زبیر فاروق، ہمایوں پرویز شاہد، فیض رسول فیضان اکرم جاذب، سرور فرحان، حکیم خان حکیم، عزیز عادل سید ضیا حسین، محمد امجد حسین، امر مبکی، عطا العزیز، سہیل یار زاہد محمود زاہد، طارق جاوید، نعیم رضا بھٹی، اسدرضا سحر عزم الحسنین عزمی، سجاد حسین ساجد، عاطف جاوید عاطف اسد اعوان، شہاب اللہ شہاب، عمر قیاز قائل، آفتاب محمود شمس فرہاد ترابی، صدام ساگر، وسیم جہان، امجد بابر، نصیر بلوچ، احمد محمود نادیہ سحر، جیا قریشی، میتھو محسن، زین علی ضوی، نعمان حیدر حامی	80 تا 184
12	شاعرِ امروز	نثار محمود تاثیر، جاناں ملک [شاہد مالکی]	185 تا 190
13	طنز و مزاح / خاکے	سعدیہ بشیر، مرزا عاصی اختر	191 تا 196
14	کتب بینی	صدام ساگر، ممتاز راشد لاہوری، جمیل احمد عدیل	197 تا 207
15	نظمیں	خورشید رضوی، امجد اسلام امجد، نسیم سحر، صفدر صدیق رضی علی اصغر عباس، حامد یزدانی، احمد جلیل، امجد بابر دردانہ نوشین خان، نائیلہ راٹھور، فیض رسول فیضان ظہور چوہان، ازہر ندیم، زعیم رشید، شاہدہ مجید، اعجاز رضوی	208 تا 224
16	خطوط	آصف ثاقب، جمیل یوسف، نسیم سحر، ممتاز راشد لاہوری آفتاب احمد ملک، فیض رسول فیضان، اشرف کمال طالب انصاری، محمد شفیق انصاری، رانا محمد شاہد	225 تا 241

حمد

ہر مرحلۂ زیست کو آساں بنا دیا
اک شہرِ علم صحرا میں تو نے بسا دیا

ختم الرسلؐ پہ نعمتیں تو نے تمام کیں
عظمت مآب ایسا شہؐ دوسرا دیا

رحمت بنا کے بھیجا شفاعت کے واسطے
شافع بنا جو حشر میں وہؐ پیشوا دیا

مختارِ کل ہے تو نے دکھایا یہ معجزہ
اُمّی لقب سا تو نے مجھے رہنما دیا

اچھا ہوا کہ دل میں فقط تیری یاد ہے
اس مکر و فن کی دنیا کو دل سے بھلا دیا

حمد و ثنا سے مل گئی تسکین ، شکر ہے
انعام تو نے یہ بھی مجھے بے بہا دیا

سبحان ہے صفت تیری الحمد معجزہ
تو نے حسنؔ کو درد عجب کام کا دیا

حسن عسکری کاظمی

حمد

تُو نظر آتا نہیں
انت خیر الخالقین

رحم کر بس رحم کر
انت خیر الرّاحمین

علم کا در کھول دے
انت خیر الکاشفین

میری بھی تکمیل کر
انت خیر الکاملین

میرے حق میں فیصلہ!
انت خیر الفاصلین

رزق دے بے انتہا
انت خیر الرّازقین

منکشف ہر راز کر
انت خیر الکاشفین

نیک رستے کھول دے
انت خیر الفاتحین

دُور کر بیماریاں
انت خیر الشافیین

تُو ہے میرا رہ نما
انت خیر الھادیین

میرے مولا بخش دے
انت خیر الغافرین

دلکشا تدبیر ہے
انت خیر الماکرین

میں ہوں رزمیؔ اے خدا!
انت خیر الفاتحین

بشیر رزمی

حمد

شمار رحمتِ ربی ہو وہ عدد نہیں ہے
میں حمد کیسے لکھوں اتنا میرا قد نہیں ہے

پناہ دیتا ہے وہ ذوالجلال والاکرام
کہ اس جناب میں تفریقِ نیک و بد نہیں ہے

وہ سب کی جھولیاں بھرتا ہے سب کا رب جو ہوا
اُسی کا در ہے جہاں مانگنے کی حد نہیں ہے

وہی ہے رازق و مالک، نہیں کوئی ذی روح
کہ جس کے واسطے اللہ کی مدد نہیں ہے

تجھی کو زیبا ہیں مالک تمام ذات و صفات
الٰہ کیسے وہ ہو گا کہ جو صمد نہیں ہے

عیاں ہیں تجھ پہ الٰہی مرے تمام عیوب
جواز کیا کہ مرے عذر کی سند نہیں ہے

ظہورِ ہستی پہ نازاں تو ہے سبھی مخلوق
مگر بمثلِ بشر کوئی خال و خد نہیں ہے

رخشندہ نوید

نعتؐ

یہ اک ستارہ جو پلکوں پہ اب سجا ہوا ہے
مرے کریم کے در سے مجھے عطا ہوا ہے

فرازِ عرش کو چوما ہے میری قسمت نے
حضورِ احمدِؐ مرسل یہ سر جھکا ہوا ہے

ازل سے روحِ رواں کو ہے آپؐ سے نسبت
مرے خمیر میں ذوقِ ثنا گندھا ہوا ہے

رسولِؐ رحمتِ عالم کا ہے کرم مجھ پر
یہ گرد بادِ الم اس لیے رکا ہوا ہے

یہ کس کی یاد کا پرتو ہے میرے لہجے میں
کہ میرے لفظوں میں اک نور سا گھلا ہوا ہے

صدائے صلِ علیٰ آئی ہر طرف سے مجھے
یہ کس کا نام لبوں سے مرے ادا ہوا ہے

یہ کس مراد کو پہنچا ہے فکر و فن میرا
کہ لفظ لفظ مرا آپؐ کی ثنا ہوا ہے

خوشا یہ کس درِ اقدس پہ خم ہوئی ہے جبیں
جہاں نیاز میں اک ناز بھی ملا ہوا ہے

بذاتِ خود ہے جہاں خامشی بھی طرزِ سخن
اسی دیار میں یہ بے نوا کھڑا ہوا ہے

طواف کرتی ہیں ہر آن منزلیں اُس کا
رہِ مدینہ میں جو بھی قمر پڑا ہوا ہے

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

پتھر سے مَیں ہو جاؤں گہر سیدؐ عالم
مجھ پر بھی عنایت کی نظر سیدؐ عالم

باقی ہے جو کچھ زیست بری، آپؐ جو چاہیں
ہو جائے مدینہ میں بسر سیدؐ عالم

کُھلتا ہے یہی آن کے سب پر دمِ آخر
کوئی نہیں دم ساز، مگر، سیدؐ عالم

کافی ہے تسلی کو یہی ایک وسیلہ
مجھ پر رہے وا نعت کا در سیدؐ عالم

خاورؔ کو معانی ہو، اگر چُوک ہُوئی ہو
اُس کو نہیں مدحت کا ہنر سیدؐ عالم

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس رُخ کروں قصیدۂ شاہِ زمن تمام
تشبیب ہی میں ہو گئی تابِ سخن تمام

نعتؐ

کرسی و عرش و زمیں، لوح و قلم تیرے ہیں
"سب زمانے تیرے، موجود و عدم تیرے ہیں"

سارے قرآن میں اُتری ہے فقط نعتِ نبیؐ
اِس کے ہر لفظ میں اَوصاف رقم تیرے ہیں

تیری اُلفت سے، تیرے اِذن، تیری رحمت سے
آئے روضے پہ جو بادیدۂ نم تیرے ہیں

تا قیامت ہے زمانے میں نبوت تیری
ضَوفشاں تا بہ اَبد، نقشِ قدم تیرے ہیں

نینوا میں سبھی پرچم جو کھلے تیرے تھے
پھر جو لہرائے زمانے میں علم تیرے ہیں

شش جہت تیرے تصرف میں، تیری قدرت میں
حکمِ ربانی سے سب عرب و عجم تیرے ہیں

عمر بھر بات تیری ایک نہ مانی ہم نے
شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے ہم تیرے ہیں

تا قیامت نہ ملے گا کوئی ثانی اُن کا
آج بھی دنیا میں اصحابِ حشم تیرے ہیں

شہر مکہ بھی ترا اور مدینہ بھی ترا
شان بالا ہے تری، دونوں حرم تیرے ہیں

عقیل رحمانی

نعتؐ

میں یہاں ہوں گماں مدینے میں
جسم ڈسکہ ہے جاں مدینے میں

کیا گھڑی تھی کہ جس گھڑی پہنچا
آپ کا کارواں مدینے میں

بن کے منگتے غرور کرتے ہیں
بادشہ بھی یہاں مدینے میں

یاد آئی بلالِ حبشی کی
جب بھی گونجی اذاں مدینے میں

رنگوں نسلوں کے ٹوٹ جاتے ہیں
سارے فخر و گماں مدینے میں

خاک میں مل کے خاک ہو شاہدؔ
یہ مرا خاکداں مدینے میں

افتخار شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آقاؐ، اے آقاؐ، اے آقاؐ، مجھ پر ہاتھ دھریں
آپ کا قرب نہ جانے کیا ہو؟ آپ کی یاد بہار

نعتؐ

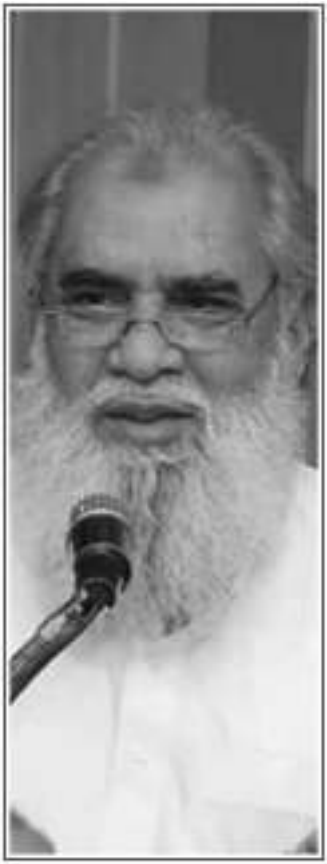

نعت کہنا چاہتا ہوں ، نعت ہوتی ہی نہیں
دوستو حدِ ادب ہے ، بات ہوتی ہی نہیں

کامیاب و کامراں ہیں، آپ کی رہ کے شہید
یعنی ان شیدائیوں کو ، مات ہوتی ہی نہیں

آ ہی جاتے ہیں کبھی آنسو خدا کے خوف سے
ہاں مگر کھل کر کبھی برسات ، ہوتی ہی نہیں

دن سے بھی بڑھ کر عبادت میں مگن رہتے ہیں لوگ
یعنی اس شہرِ نبی میں رات ہوتی ہی نہیں

سچ کہا ہے ، جو نہ ملتی ہو تمہارے شہر میں
ایسی دنیا میں کوئی سوغات ہوتی ہی نہیں

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آپؐ کے ہاتھ قبول کریں تو کنکر بول اُٹھیں
آپؐ کے ذکر کا ہالہ ٹھہرے یہ شعری اظہار

نعتؐ

وردِ درود پاک نے ایسا کمال کر دیا
فکر و دل و نگاہ کو شاخِ نہال کر دیا

لہجہ مرے رسول کا معجزۂ مقال تھا
جس نے ہر ایک تند خو شیریں مقال کر دیا

عزتیں بخش دیں تمام کس نے صہیبِ روم کو
کس نے رخِ بلال کو رشکِ جمال کر دیا

نعت نبی سے فکر میں ایسے گلاب کھل اٹھے
حرف و خیال و صوت کو خوشبو مثال کر دیا

دونوں جہاں کی دولتیں اس پہ نثار ہو گئیں
جس نے فدا حضور پر مال و منال کر دیا

دیکھا تو ماند پڑ گئے فکرِ غزل کے آفتاب
نعت نبی کا جس گھڑی رکھا نکال کر "دیا"

ہم نے شعور و آگہی طاق میں جب سے رکھ دیئے
جہل کی تیرگی نے تو جینا محال کر دیا

ان کے کرم کا معجزہ سرورِ کم نگاہ دیکھ
تجھ سے بھی کند ذہن کو مدح مقال کر دیا

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

ذکرِ نبیؐ سے ذکرِ خدا کی طرف گئے
یعنی ثنا کے بعد دعا کی طرف گئے

مطلوب تھا خیال کو رنگین پیرہن
ہم ریگزارِ شہرِ وفا کی طرف گئے

خوش بخت ساتھ توشۂ مدحت لیے ہوئے
دارِ فنا سے دارِ بقا کی طرف گئے

دریوزگی کے واسطے خورشید و ماہتاب
شہرِ نبیؐ کے صبح و مسا کی طرف گئے

دینے رہائی پنجۂ باطل سے دین کو
میرے حسینؓ کرب و بلا کی طرف گئے

گزرے ہیں شہرِ نعت سے جتنے بھی قافلے
حسانؓ!! تیرے رنگِ نوا کی طرف گئے

مظہر سروں پہ چھا گئی اِدبار کی گھٹا
تب لوگ ذکرِ صلِ علیٰ کی طرف گئے

مظہر حسین مظہر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پا آبلہ نے اُٹھ کے خس و خار چن لیے
رہ دیکھتے ہی رہ گئے سرو و سمن تمام

نعتؐ

منتظر ہیں یا نبیؐ کب ہو اشارا آپؐ کا
غم کے ماروں کو جہاں میں ہے سہارا آپؐ کا

وادیِ عشق و وفا کی راہ میں یا مصطفیٰؐ
جان و دل سے بڑھ کے ہم کو نام پیارا آپؐ کا

ڈگمگائے گا نہ ہرگز امتی، روزِ جزا
حشر میں جب دیکھ لے گا اک نظارا آپؐ کا

روشنی کے سب حوالے ماند ہی پڑتے گئے
دو جہاں میں اس طرح چمکا ستارا آپؐ کا

"رحمتٌ للعالمیں" سے بس یہی فریاد ہے
مجھ سے عاصی کو ملے دامن خدارا، آپؐ کا

ہر مصیبت کٹ گئی دکھ درد سے راحت ملی
نام صدقِ دل سے جس نے بھی پکارا آپؐ کا

طلحہ غفور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چہرہ تمام رنگ تھا ، پیکر کرن تمام
کجلا کے رہ گئے مہ و پروین تن تمام

نعتؐ

جانا ہے خلد میں تو یہ زینہ ہے نعت کا
سو دفترِ یقیں میں قرینہ ہے نعت کا

ان پر درود بھیج کے میں نعت کہتا ہوں
اس دل میں اس لیے بھی مدینہ ہے نعت کا

محشر کے روز بحرِ عمل میں ہے ان کا اسم
بختِ رسا میں یعنی سفینہ ہے نعت کا

دل میں دھڑک رہی ہے مرے خواہشِ درود
یہ مال و زر نہیں یہ دفینہ ہے نعت کا

آقائے دو جہاں کی عطا ہے اسی لیے
شعروں میں اپنے دیکھ قرینہ ہے نعت کا

آرش جواہرات سے مطلب نہیں مجھے
خوش ہوں کہ میرے پاس خزینہ ہے نعت کا

علی آرش

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لکھتے ہی اُنؐ کا اِسم مُبیںؐ جھلملا اُٹھیں
عرشِ ورق پہ کاہ کشانِ سخن تمام

عقیدت

ملے ثاقب قرینے کے اجالے
ہمیں مکّے مدینے کے اجالے

منور کر دیے کعبے نے منظر
ہوئے شامل مدینے کے اجالے

نبیؐ کا نور جب دنیا میں اُترا
رواں ہیں اس مہینے کے اجالے

جہاں میں سبز گنبد سے ہوئے ہیں
مدینے کے نگینے کے اجالے

جبینوں کی چمک رمزِ عبادت
ہیں کعبے سے پسینے کے اجالے

دعا سے روشنی پائے سکونت
سفر میں ہوں سفینے کے اجالے

رسالت اور وحدت کے عقیدے
ہوئے ہیں مرنے جینے کے اجالے

آصف ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اس کے آگے کم جانوں کو جان کا خوف نہیں
اس کے آگے برف کے گالے سر پہ فلک کہسار

عقیدت

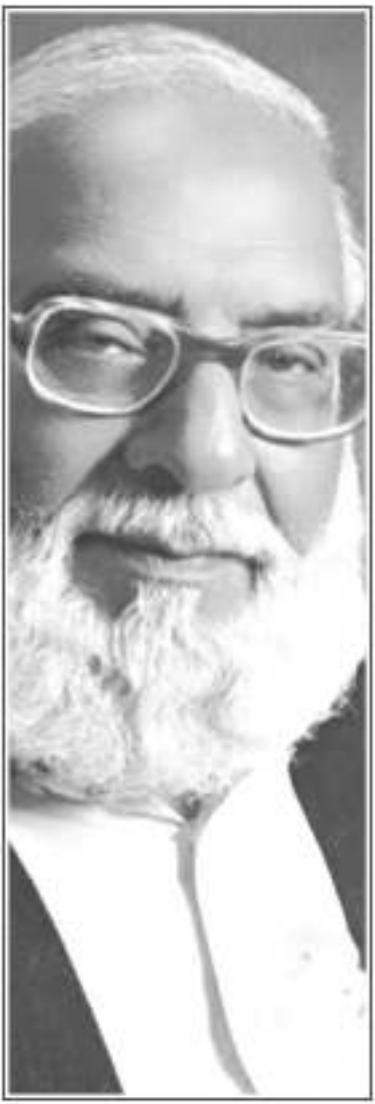

نعت کیا ہے بس آپ کی تعریف
رب بھی کرتا ہے آپ کی توصیف

اس نے قرآن آپ کو بھیجا
وصفِ ذاتی ہے اس کی یہ تصنیف

نعت جب بھی ہے روح میں اتری
مضمحل قلب کی ہوئی تالیف

منصبِ نعت ہے مسیحائی
دور کرتی ہے روح کی تکلیف

نعت پڑھتے ہی نیکیاں جاگیں
ہر برائی میں ہو گئی تخفیف

جس بھی محفل میں ذکرِ احمد ہو
آپ لاتے ہیں اس میں خود تشریف

آپ کا جو بھی دم نہیں بھرتا
حق رسی میں ہوا نحیف و ضعیف

حسن نعت ریاض کا ہم دم
ہے وہ صادق امین میرا حلیف

سید ریاض حسین زیدی

صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ

نسخۂ ردِّ ہر بلا صلِّ علیٰ محمدٍ
ہے اِسی حرف سے شفا صلِّ علیٰ محمدٍ

صَلِّ عَلیٰ نَبِیِّنَا میں کہاں ، کیا مرا درود؟
یہ تو خدا کی ہے عطا صلِّ علیٰ محمدٍ

تھی مری جو بھی ابتدا، اُس سے مجھے نہیں غرض
ہو مری اس پہ انتہا صلِّ علیٰ محمدٍ

دل کا مرض کہ جاں کا ہو، خوف کسی زیاں کا ہو
پڑھتا رہوں سرِ دوا صلِّ علیٰ محمدٍ

کون ہے اکمل البشر؟ جب لگی ڈھونڈنے نظر
حُسن نے عشق سے کہا: صلِّ علیٰ محمدٍ

چھوڑ دے اور سلسلے، سالکِ حق! ترے لئے
اُس میں فنا سے ہے بقا صلِّ علیٰ محمدٍ

گُل ہیں جہاں کو جو ملے، اس کی بہار سے کھلے
رحمت و راحت و رَجا صلِّ علیٰ محمدٍ

فرض ہے سب پہ اُس کا حق جس کے خُلق کا ہر ورق
مہر و مروّت و وِلا صلِّ علیٰ محمدٍ

بھیجے خدا سلام اسے جس کے کرم کے آئینے
عفو و حمایت و سخا صلِّ علیٰ محمدٍ

اس پہ فدا ہر آسماں جس کے عُروج کے نشاں
عظمت و رَفعت و عُلا صلِّ علیٰ محمدٍ

اس نے کیا ہے ٹھیک سب، مانگیں اسی سے بھیک سب
حِلم و حَلاوت و حیا صلِّ علیٰ محمدٍ

علم و شعور و آگہی میں ہے جہاں بھی آدمی
سب کا اسی سے ارتقا صلِّ علیٰ محمدٍ

سب کی اُسی سے آبرو، کرتے ہیں جس کی آرزو
حُبّ و اِطاعت و رِضا صلِّ علیٰ محمدٍ

عالمِ خلق و امر میں صبحِ ازل سے تا ابد
ہے وہی نورِ حق نما صلِّ علیٰ محمدٍ

مرزا آصف رسول

وہ جو ہر اک نبی سے تھا عہد لَتُؤمِنُنَّ بِہٖ
اس میں بھی نکتہ ہے تو کیا؟ صلِ علیٰ محمدِ

مفتعلن مفاعلن کی تھی سمائی سر میں دھن
خود کو نہ میں سنا سکا صلِ علیٰ محمدِ

کیا یہ درود ہے وہی؟ پڑھتے تھے جس طرح کبھی
صبر و صداقت و صفا صلِ علیٰ محمدِ

جنگ ہے جیسی کفر سے نعرہ لگائیں کاش پھر
جرأت و غیرت و وفا صلِ علیٰ محمدِ

اصل درود ہے یہی جاں سے گزر کے دل کہے
کم ہے ابھی جو ہے فدا صلِ علیٰ محمدِ

لفظ بجا سہی، مگر پورے وجود سے بشر
کر نہ سکے یہ حق ادا صلِ علیٰ محمدِ

آصفِ بے نوا! بنا اشقوں سے کاسۂ درود
ڈال پھر اس میں ہر دعا صلِ علیٰ محمدِ

رباعیات

سورج ہے عجیب، کچھ اُجالا کر کے
اک اگلی صبح کا تقاضا کر کے
ہر رات ستاروں کو بجھا دیتا ہے
ہر روز نکلتا ہے تماشا کر کے

☆

حیرت کی فراوانی گھر پر ہے میاں
باہر بھی گھر جیسا منظر ہے میاں
آنکھیں نہ جلا کہ اندروں جل جائے
خاموش کہ خامشی ہی بہتر ہے میاں

☆

کِھل سکتا ہے گوہر سے گُلِ ریحانی
جوہڑ سے نکل سکتا ہے میٹھا پانی
یہ جہلِ مرکّب جو نہیں تو کیا ہے؟
نادان کی نادانی پر حیرانی

☆

ایسا بھی بے خبر کوئی دل ہوگا؟
جو اپنے پس و پیش سے غافل ہوگا
پہچان نہیں سکا جہالت کا مزاج
مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی جاہل ہوگا

☆

بے کار ''نمی دانم'' و ''دانم'' کی نمود
موجود کا امکان بھی ہے ناموجود
یہ علم، یہ گیان دھیان، اللہ غنی!
دربار جہالت میں یک سَر مردود

☆

کانٹوں کے بدن سے تازگی لیتے ہیں
پانی جو نہیں، سراب پی لیتے ہیں
ہر روز جو تیرا غم ہمیں مارتا ہے
ہر روز نشاطِ غم سے جی لیتے ہیں

☆

بے امکانی کو نذرِ امکان کریں
کچھ جاننے بوجھنے کا سامان کریں
معلوم ہوا کہ کچھ نہ معلوم ہوا
آ، اپنی جہالت کا اعلان کریں

ے ''معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد'' (نصیرالدین طوسی کی رباعی کا ایک مصرعہ)

خالد علیم

سرابوں سے سرابوں تک

جس دور میں دانائی کمی اور کج علمی رواج پا جائے جب سطحیت گہرے فنون کی جگہ لے لے جب آنکھ سے معصومیت رخصت ہو جائے اور اس کی جگہ چالبازی اپنا مسکن بنا لے جب دل میں ایمان کی جگہ شک وشبہ اور وسوسہ آجائے جب معاذ اللہ روح میں خشیت کی جگہ انکار آجائے تو پھر انسان اور انسانیت سرابوں کے پیچھے تیزی سے بھاگنے لگتی ہے۔

چلیئے یہ تو اک سائینسی رو سے فزکس کے طلباء کی بحث ہے کہ کلی داخلی انعکاس کی رو سے سخت گرمی میں گاڑی چلاتے ہوئے آپ کو دور سڑک پر پانی کی لہریں سی نظر آتی ہیں صحرا میں پیاسے کو دور پانی سے بھرا سمندر نظر آتا ہے مگر جوں جوں سڑک پر آپ آگے جائیں یا صحرا میں پیش قدمی کریں یہ پانی یا سراب اور دور ہوتا جاتا ہے زندگی میں بھی اس طرح کے کئی سراب در پے آزار رہتے ہیں رشتوں کے سراب جھوٹی محبتوں کے سراب شارٹ کٹ سے امیر بننے اور عظیم بننے کے سراب جلد از جلد کامیابیاں حاصل کرنے یا دلانے والے سراب سکون و خوشی اور آسانیاں دلانے والے سراب بندہ ان سرابوں کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے اور عمر رائیگاں اسی میں کٹ جاتی ہے امیدوں کی کائی چھٹ جاتی ہے تو احساس ہوتا ہے کہ زندگی سرابوں سے سرابوں تک بھاگ دوڑ ہی میں ختم ہوگئی۔

یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ وہ کون کون سے لوگ ہیں جو ان سرابوں سے بچ کر حقیقی خوشیاں کامیابیاں کامرانیاں اور مسرتیں حاصل کر سکتے ہیں۔ تھوڑا بہت شعور رکھنے والے کے سامنے انسان خدا اور کائنات کی تکون تو موجود ہوتی ہی ہے اب ان کا آپس کا تعلق ہی سراب پیدا کرتا ہے سرابوں کا پیچھا

سلیمان عبداللہ ڈار

کرنے پر اکساتا ہے یا ان سرابوں سے بچا کر حقیقی کامیابی اور خوشی کی منزل پر پہنچاتا ہے انسانوں میں بھی کئی گروہ ہیں عقیدہ رکھنے والے اور نہ رکھنے والے مثلاً لوگوں کی عمومی نظر کے مطابق ذہین ترین سائنس دان آئن سٹائن کہتا ہے کہ میں نے بہت غور کیا ایسا لگتا تو ہے کہ اس کائنات کا کوئی آرگنائزر ضرور ہے مگر پھر بھی میں پرسنل گاڈ پر یقین نہیں رکھتا سوچا جائے تو اس کے مقابلے میں اک سادہ دل ایمان والا جس سے رب کو پیار ہے یا جسے رب سے پیار ہے اور اک محبت بھرا تعلق بھی ہے یہ تعلق ان سائنس دانوں اور انکی سوچ سے کہیں افضل ہے جو تشکیک کی وادیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں اس طرح ویسٹرن ورڈم میں بہت بڑا نام برٹ رینڈرسل کا ہے جس کا کلام اقبال میں بھی تذکرہ ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے کائنات کے نظام کو بہت اسٹڈی کیا کچھ باتوں کی سمجھ آئی مگر زیادہ باتوں کی ذہن تک رسائی نہ ہو سکی اس لیے (معاذ اللہ) میں ملحد ہوں۔

اک بات تو طے ہے کہ سوچنے سمجھنے مطالعہ کا شوق رکھنے والے بہت سے دانشور عقیدے والے ہیں کچھ بے عقیدہ بھی ہیں بے عقیدہ بندے کے پاس دانش اور دانائی کیسے آئے گی کہ وہ تو ہے ہی بے یقینی کا شکار! سرابوں کے پیچھے بھٹکنے والے ان نام نہاد دانشوروں سے یہی عرض کیا جاتا ہے کہ سرکارؐ دو عالم کی زندگی کا ایک ایک منٹ سب کے سامنے ہے یہ اک ایسا عظمت کا مینار ہے جسے چھان پھٹک کر دیکھ لیں آپؐ کا انکار ممکن ہی نہیں بس منزل کو پانا ہو تو سرابوں کو خیر آباد کہہ کر آپؐ کے پیچھے پیچھے چل پڑیں عرفان ذات بھی یہیں سے ملے گا اور ہر الجھن کا سلجھاؤ بھی انہی کے دامن سے نکلے گا اس در سے وابستگی کو بے عقیدہ بندہ کیسے سمجھ سکتا ہے۔ گمراہی کی مکڑیوں نے بڑے مہیب جالے بھی تنے ہوں فاران کی چوٹیوں سے اور غار حرا کی تاریکیوں سے نکلی ہوئی ہدایت کی ایک ہی کرن یہ جالے صاف کرنے کی قوت رکھتی ہے۔

تو نے اے نور مجسمؐ! راز یہ افشا کیا
ہے اندھیرا خود ہی اپنا، خود اجالا آدمی
کاش! تیرے چشمہ حیراں پہ آ پہنچے کبھی
یہ سرابوں سے سرابوں تک بھٹکتا آدمی

.....

تخت دار اور تخت شاہی اپنی اصل میں بذات خود کچھ بھی نہیں ہیں بے یقین بے عقیدہ مغضوب ہی رہے گا چاہے اس کے اردگرد کتنے ہی آسائشوں کے نقشے موجود ہوں۔ تخت شاہی کے سراب کی طرف تیزی سے بھاگنے والوں کو کیا معلوم کہ چار براعظموں پر حکومت کرنے والے سیدنا حضرت عمرؓ کتنے مطمئن اور مسرور تھے وہ بھی آج کل

کے حکمرانوں کی طرح نہ ہی بے سکون رہے نہ ہی احتساب کے نام سے خوف زدہ ہوئے کیوں؟ اس لیے کہ صحابہؓ کی تربیت ہی ایسی ہوئی تھی کہ وہ چادر سے باہر پاؤں پھیلاتے ہی نہ تھے۔

راقم کو بہت سے ملکوں میں سیر و سیاحت کا اتفاق ہوا۔ ہانگ کانگ سے ایک بار فیری میں سوار ہو کر میکاؤ کا خوبصورت جزیرہ دیکھنے گئے سامنے اک بڑا ٹمپل تھا تاؤازم اس طرف کے ملکوں میں مانا جانے والا مذہب ہے لوبان اور صندل کی خوشبو والی گول اگربتیاں ہولے ہولے سلگ رہی تھیں دور دراز سے آئے ہوئے زائرین سالخوردہ بڑے بڑے پیالوں میں رکھے پانی کو پی رہے تھے جو ان کے عقیدے کے مطابق مقدس پانی تھا پوجا پاٹ بھی ہو رہی تھی میں اک سفرنامہ لکھنے کے شوق میں ان ملکوں میں پھرتا رہا اور یہ بھی سوچتا رہا کہ اسلام کے حقیقی ازلی اور ابدی سچے پیغام کو اب بھی پھیلانے کی کس قدر ضرورت ہے یعنی خود مسلمان بھی اصلی دین پر چلیں اور اس کی دعوت بھی دیں بدھ مت کے مندروں میں بھی جا کر دیکھا بہت سے بدھ بھکشوؤں سے بہت سے ملکوں میں ملاقاتیں ہوئیں چین تھائی لینڈ اور سری لنکا میں ان کی اکثریت ہے تھائی لینڈ میں مشہور بدھ ٹمپل سویا ہوا بدھا گولڈن بدھا اور ایمارلڈ بدھا ہیں سلپنگ بدھا کے قریب ہمارے دینی مدارس کی طرز پر مدرسہ بھی ہے وہاں کے بڑے پجاری سے بات ہوئی تو اسے دلائل دیئے کہ

،،جو سوجائے وہ رب نہیں ہوتا،،

اسی طرح پڑوسی ملک بھارت میں ایک ارب سے زائد لوگ اپنے ہاتھوں سے بھگوان تراشتے ہیں اور اسے پوجتے بھی ہیں۔ قرآن مجید میں سادہ سے طریقے سے سمجھایا گیا ہے کہ ان بتوں کے سامنے جو چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں ان پر سے یہ تو اک مکھی کو بھی اُڑا نہیں سکتے تو مشکل کشا اور حاجت روا کیسے ہوئے قرآن مجید نے تو چیلنج کیا ہے کہ رب کے سوا کوئی بھی مچھر کا اک پر بنا کر دکھا دے مگر یہ ایسا نہیں کر سکیں گے انسان کو رب کی ضرورت ہے اگر انبیاء نہ بھی آتے سچے رب کا پتہ نہ بھی دیتے تو انسان اپنے لیے معاذ اللہ کوئی خدا تخلیق کر لیتا تو پھر کیوں نہ طاقتوں اور قدرتوں والے ایک اللہ کو اپنا سب کچھ سونپ دیں انسانیت صدیوں بھٹکتی رہے تو بھی سسکتی تڑپتی دنیا کو اللہ جل شانہ کے ہاں ہی جا کر سکون ملے گا۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرم خانہ خراب کو، تیرے عفو بندہ نواز میں

.....

وہ تو بندہ نوازی کے لیے اپنی رحمت پھیلائے ہوئے ہے مگر انسان کبھی کسی بُت کے آگے سجدہ ریز ہے کبھی خواہشات کے مندر میں آرزوؤں کی گھنٹیاں بجاتا پھرتا ہے انسان کتنا بے بس ہے پریشانیوں سے دکھوں تکلیفوں اور نارسائی سے گھبرا کر سرابوں سے سرابوں تک کے سفر کی دشوار گذاری سہتے سہتے چکنا چور ہو کر بندہ جلد یا بدیر اک اللہ اکیلے تن تنہا اللہ کے سامنے امنگوں سے بھرا ہاتھ پھیلا دیتا ہے اس کی آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں جو دعا کا روپ دھارے ہوئے ہوتے ہیں وہ سرابوں کی مار کھا کر خوار ہو کر آیا ہوتا ہے کیا اسے بے بسی کہا جائے نہیں، نہیں یہ آنسو تو سرابوں کی نفی ہیں رب پر اعتماد کے آنسو ہیں یہ دعا ہیں خواہش ہیں محبت سے بھرے آنسو ہیں جس پر بھروسہ ہو غم خواری کا زعم ہو صرف اور صرف اسی کے سامنے آنسو بہائے جاتے ہیں جو دلدار نہ ہو وہ آنسوؤں کی بے قدری کرتا ہے یہ آنسو اپنی طاقتوں پر عدم اعتماد کا اعلان ہیں اور رب سے ہونے کا یقین ظاہر کر رہے ہیں سرابوں کو حقیقی منزل سے آشنا ہونے کا یقین ہو تب آنکھیں نم ہوتی ہیں یہ درد یہ سوز ہی تو بے کراں دولت ہے۔

متاعِ بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

بندگی ہی ایسا مقام ہے جو بندے کو سدرۃ المنتہیٰ تک لے کر جاتا ہے اور پھر 'عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ' کا اعلیٰ ترین منصب بھی عطا ہوتا ہے انبیاء کا ڈائریکٹ رب سے تعلق بھی ہوتا ہے اور رابطہ بھی اسی لیے ان کے ذمہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو سراب اور منزل کا فرق بتائیں بھی اور سمجھائیں بھی اور وہ کیسے سمجھاتے ہیں کیسے اپنی ہر خواہش کو تج کر اس کام کو کرتے ہیں کہ رب کریم خود فرما دیتے ہیں۔

،،آپؐ نے رب کا پیغام نہ صرف پہنچایا بلکہ پہنچانے کا حق ادا کر دیا،،

در بدری دراصل ایک ٹھکانے ہی کے لیے تو ہوتی ہے گرتا پڑتا بندہ اپنی زندگی کی باقیات کو اکٹھا کر کے جب اپنے خالق کے در پر جھکتا ہے تو اسے بندے پر ترس بھی آتا ہے پیار بھی، وہ کبھی کبھار اسے ڈراتا بھی ہے پھر صلح بھی کر لیتا کہ وہ 'جبار قہار' تو ہے ہی مگر اس سے کہیں زیادہ 'رحیم کریم' بھی ہے اور 'غفار' بھی وہ کہتا ہے میری پکڑ بڑی سخت ہے اور یہ بھی فرما دیتا ہے کہ ستر ماؤں سے زیادہ محبت بھی ہے اور یہ محبت رب نے بتائی یہ عربوں کو سمجھانے کے لیے بتائی کہ وہ ستر کے عدد کو بہت بڑا سمجھتے تھے دراصل اس سے مراد ہے بہت زیادہ ہماری سوچ اور وجدان سے بھی کہیں زیادہ!

سرابوں کی طرف دوڑ دوڑ کر زخمی ہو جانے

والا بندہ جب رب کے سامنے ہاتھوں کا پیالہ پھیلا دیتا ہے جبین نیاز جھکا دیتا ہے تو رب کو پسند آ جاتا ہے اور بعض اوقات تو رب کریم کو اس کا گڑگڑانا اتنا بھلا لگتا ہے کہ وہ عطا کو موخر کر کے اس کی دعائیں مناجات آہیں آنسو اور فریادیں یہ سب دیکھنا اور سننا چاہتا ہے کہ وہ تو یوں بھی 'سمیع و بصیر' ہے اسے فریادی بھی پسند آ جاتا ہے فریاد بھی دلبری بھی اچھی لگی دلداری بھی وہ پیار کچہری کا جج ہے چاہے تو عدالت برخاست ہونے سے پہلے ہی باعزت بری کر دے چاہے تو عدالت نہ بھی لگائے یونہی جانے دے بلکہ بہت کچھ دے دلا کر جانے دے اور جانے بھی کہاں دے گا اپنے پاس ہی رکھ لے گا قرب عطا کر دے گا فریادی تو پہلے ہی سرابوں عذابوں حبابوں خانہ خرابوں اور گردابوں کا مارا ہوا ہے اسے تو اب کہیں اور جانا ہی نہیں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہیں کا ہو کر رہ گیا وہ سوچتا ہے کیسی خوبصورت قید ہے عمر بھر نہیں سدا یہیں پابند سلاسل رہیں تو زندگی کا مزا آ جائے۔

اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے۔

اب اسی کے ہو گئے تو اس کی ذات بھی قبول کر لی اسکی بات بھی اس کی صفات بھی مان لیں اپنی حاجات بھی بتا دیں اپنی عادات بھی اس کے حکم کے تابع کر دیں اور آفات سے پناہ بھی مانگ لی تو پھر کائنات ہی اپنی ہو گئی کہ اس سے ذاتی طور پر چاہت جو کر لی جب اس کی ذات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے تو یہ چاہت والا رشتہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے ذات کا تعلق تو حشر کے دن تک رہے گا۔ قبر میں حشر میں پل صراط پر اور جنت میں بھی (جو وہ اپنے فضل سے یقیناً عطا کرے گا اور جہنم کی ہولناکیوں سے ان شاء اللہ بچا بھی لے گا) یہ تعلق سراب نہیں حقیقت ہے جو لڑکپن میں بھی رہے گا جوانی میں بھی پیرانہ سالی میں بھی رہے گا صحت میں بھی رہے گا بیماری میں بھی زندگی میں بھی رہے گا زندگی کے بعد بھی۔ اب اس سے کیا ہو گا زندگی میں سکون آئے گا سرخوشی آئے گی طمانیت کا دل پر راج ہو گا اب آپ اک ایسے جہاں میں آ جائیں گے جو سب سے انوکھا سب سے نرالا ہے اس میں دکھ آ جائے تو بھی دکھ نہیں لگے گا تکلیف تو ہو گی مگر شکایت یا واویلا نہیں ہو گا آپ معاف کر دینے والا ایسا سمندر بن جائیں گے جس میں اضطراب کا کوئی طوفان نہیں اٹھے گا اس کی ہر لہر نرم خو اس کا ہر جھونکا نرم گفتار ہو گا۔ یعنی اک ایسی زندگی مل جائے گی جس کا کوئی بھی دن ہمیں صدمہ نہیں پہنچائے گا کہ سراب اور حقیقت میں یہی فرق ہے اور یہ فرق قطب شمالی سے قطب جنوبی تک کے فاصلے سے بھی کہیں بڑا ہے۔

☆☆☆☆☆

گودی

کپتان نور منیر گل آفریدی جب کمرے میں داخل ہوا تو گل بانو کا جنازہ بڑے کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ سارے محلے کی عورتیں گھیرا ڈالے بیٹھی تھیں - وہ بار بار رو کر کافی نڈھال ہو چکی تھیں پھر بھی جب نور منیر کو دیکھا تو ایک دم چیخ و پکار کا نیا طوفان اٹھا۔ اعصابی طور پر تھکی ہاری عورتوں کے اندر آخری واویلا کلبلانے لگا۔

ابھی ایک ماہ پہلے نور منیر سب گھر والو سے مل کر گیا تھا۔ ایک دن کے لیے اچانک آ گیا تھا۔ وہ پہاڑوں کے اس پار دہشت گردوں کی سرکوبی میں بھیجی جانے والی فوج میں شامل تھا۔ اسے سامان خورونوش لانے کے لیے ایک روز کے لیے شہر بھیجا گیا تھا۔ وہ ذرا کی ذرا گل بانو کو دیکھنے اور اپنے اڑھائی سالہ بیٹے منور منیر گل کو ملنے آ گیا تھا۔ اس وقت گل بانو نہا کر دھوپ میں اپنے لمبے بال سکھا رہی تھی۔ نور منیر کو دیکھا تو ہیجان کے مارے کنگھا اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ جھک کر اُٹھانے لگی تو سارے بال چہرے پر چھا گئے۔

نور منیر نے آگے بڑھ کر کنگھا بھی اُٹھایا اور اس کا سر بھی اونچا کیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس کے چہرے سے بال ہٹاتے ہوئے بولا: کاش میں شاعر ہوتا اور بالوں سے جھانکتے ہوئے چہرے کو چاند سے تشبیہہ دے کر کوئی شعر ہی کہہ دیتا۔

ابھی وہ شرماتی لجاتی کھڑی کچھ کہنا چاہ رہی تھی کہ اندر سے منور منیر دوڑتا ہوا آیا۔ باپ کو دیکھا تو بابا کہہ کر ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

گل بانو شرما کر پیچھے ہٹ گئی۔

اس نے اس بات کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا۔

کیسے آنا ہوا.....؟

باس نے سامان لانے کو بھیجا تھا۔ میں جان بوجھ کر اس سڑک سے جا رہا تھا، تاکہ تمھیں ایک نظر دیکھتا جاؤں۔ اس نے جھک کر بیٹے کو اُٹھا لیا۔

اتنے میں اس کی ماں باہر نکل آئی۔ میں صدقے میرا پُتر آیا ہے؟

بشریٰ رحمٰن

ہاں اماں...... اس نے دوڑ کر ماں سے پیار لیا۔

ایسے ہی چند منٹوں کے لیے آیا ہوں۔ ساتھیوں کے لیے کھانے کا سامان لینے آیا تھا، ٹرک باہر کھڑا ہے۔ بس چلتا ہوں۔

ارے کچھ کھائے گا نہیں۔ آج میں نے سرسوں کا ساگ اور مکی کی روٹی بنائی ہے۔ چل بانو میرے پتر کے لیے تازہ روٹی بنا۔

نہیں اماں! اس نے بیٹے کو نیچے اُتار دیا۔ اس وقت نہیں...... رک جاؤ گل بانو۔ اس نے اپنی بیوی کو روکا۔ بس آپ لوگوں کو دیکھ لیا، اتنا ہی کافی ہے۔ اب چلتا ہوں۔ صرف پانچ منٹ کا انھیں کہہ کر آیا تھا۔

پھر کب آئے گا نور منیر...... ماں نے پوچھا۔

ابھی لمبی چھٹی نہیں مل سکتی، جونہی چھٹی ملی تو آجاؤں گا۔ وہ باہر کو مڑنے لگا......

اماں۔ آپ لوگ اس طرح صحن میں نہ کھڑے ہوا کریں۔ اندر بیٹھا کریں۔ ابھی ڈرون حملوں کا خطرہ ختم نہیں ہوا۔ وہ لوگ کسی بھی وقت حملہ کر دیتے ہیں۔ میں یہ کپڑے اتارنے آئی تھی۔ گل بانو نے کپڑوں سے بھری تار کی طرف دیکھ کر کہا۔

چلو چلو...... تم بھی اندر چلو۔

دادی نے پوتے کو اُٹھا لیا اور اندر کو چلی۔ نور منیر نے ایک بھرپور مگر ترستی ہوئی نگاہ گل بانو پر ڈالی۔ جس کا مطلب سمجھ کے اس کے رخسار گلابی ہو گئے۔ ہونٹوں سے سیٹی مار کر وہ باہر نکل گیا۔ وہ کیا جانتا تھا کہ گل بانو سے یہ ملاقات آخری ملاقات بن جائے گی۔

صبح سے گاؤں کی فضا زرد ہو رہی تھی اور گل بانو کا جی بھی ماندہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی ساس سے، کہ جو رشتے میں اس کی پھوپھی بھی لگتی تھی کہا بھی......

بوا جی...... پتا نہیں میرے کلیجے میں کچھ ہو رہا ہے۔ جیسے کوئی ہاتھ ڈال رہا ہے۔ دلہن تھوڑا آرام کر لے یوں سارے کام نمٹانے کو لگی ہے۔ جیسے کل نہ ہو گی۔

گل بانو کا تیسرا مہینہ لگا تھا۔ یوں بھی طبیعت گری گری رہتی تھی۔ ایک روز نور منیر نے شرارت سے کہا تھا......

اس بار مجھے ایک بیٹی دے دو۔ بالکل اپنی طرح کی۔ پھر میں تمھاری چھٹی کرا دوں گا۔

اونہہ وہ لاڈ سے کر مسکرائی۔

اگر بیٹی نہ ہوئی...... تو......

تو...... وہ بھی مستی میں بولا۔ مشقت میں لگی رہنا۔ دونوں زور سے ہنس پڑے تھے۔ بچپن کی منگ تھی۔ لڑکپن کا پیار تھا وہ بھی ماں باپ کی اکلوتی تھی اور نور منیر بھی پانچ بہنوں کا ایک بھائی تھا۔

بے سکونی کا ایک عجیب سا واویلا نما شور اُٹھا تھا جب اچانک ڈرون آتا تھا۔ منور منیر باہر صحن میں اپنے چھوٹے سے سکوٹر پر گھوم رہا تھا گل بانو جھپٹ کے نکلی اس کو بازو سے پکڑ کر اندر گھسیٹ لائی۔ یہ ایک احساس تھا جو گاؤں والوں کو چوکنا کر دیتا تھا۔ اندر آتے ہی منور منیر رونے لگا۔ چلانے لگا۔ میری سکوٹی ہائے میری سکوٹی۔

وہ پلک جھپکنے میں سکوٹی پکڑنے گئی تھی۔ اس لمحے ڈرون کا میزائل آ کر لگا تھا اس کو۔ اس کی صحرائی دار گردن ریشمی تن سے الگ ہو گئی تھی۔ چینی کی گڑیا کی طرح وہ ٹوٹ گئی تھی۔ گاؤں میں، کونسی آنکھ تھی جو نم نہ تھی۔ کونسا جگر تھا جو پاش پاش نہیں ہوا تھا کون تھا جو اس کی ہنستی مسکراتی اور گلاب کی طرح کھلتی جوانی کا نوحہ نہیں کر رہا تھا۔ گل بانو جو صرف جینے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ بھری بہار میں مر گئی تھی۔ وہ بھی ایک حادثاتی موت، دل ہلا دینے والی موت، کبھی نہ بھول سکنے والی موت.....

آہ و بکا کرتی اور سینے پر دوہتڑ مارتی عورتوں کے ہجوم میں نور منیر نے اپنی بیوی کا آخری دیدار کیا..... پھر سب کے ساتھ مل کر جنازہ اُٹھایا۔ کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے لوگ بڑے دروازے سے باہر نکل گئے۔ مغرب سے پہلے دفنانا تھا۔ کسی نے دیکھا ہی نہیں کہ اڑھائی سال کا منور منیر ننگے سر، ننگے پاؤں جنازے کے پیچھے پیچھے باہر نکل گیا تھا۔ تمام رسومات سے فارغ ہو کر، لوگوں کو رخصت کر کے سوجی ہوئی آنکھوں اور شکستہ قدموں کے ساتھ نور منیر اندر اپنے کمرے میں آ گیا۔ پلنگ پر بیٹھنے سے پہلے اسے اپنے بیٹے منور منیر کا خیال آ گیا۔ واقعی..... اس سارے معاملات میں اسے وہ کہیں نظر بھی نہیں آیا تھا عجیب بات ہے۔ بیوی کے صدمے نے اسے اولاد بھی بھلا دی تھی۔ اب جو خیال آیا تو بے چینی سے باہر نکلا۔ دالان میں رشتہ دار عورتیں رضائیاں اوڑھ کر الٹی سیدھی سو رہی تھی۔

اماں..... اماں..... پکارتا وہ اپنی ماں کے کمرے میں چلا گیا۔ اماں ..... اس کی ماں سر پر کپڑا باندھے ابھی لیٹی ہی تھی۔ آواز سن کر اُٹھ بیٹھی۔

صدقے اماں.....!

اماں..... اس نے اماں کو پلنگ پر بے چین نظر دوڑاتے ہوئے کہا..... منور منیر کہاں ہے اماں.....

اماں بھی چونک گئی۔ اپنے ہی پلنگ پر ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگی۔

شام کو میں اسے یہاں سلا گئی تھی..... ہیں..... کدھر گیا۔ اماں پلنگ سے اُٹھ کر ادھر ادھر اور پلنگ کے نیچے دیکھنے لگی۔

شور مچ گیا۔ منور منیر کہاں ہیں۔ کس کے پاس ہے۔ ساری سوئی ہوئی عورتیں جاگ اُٹھیں۔ اک اک کوٹھڑی میں دیکھا گیا، قریب والے گھروں میں ڈھونڈا گیا۔ جہاں فون ہو سکتے تھے۔ وہاں فون کیے گئے مردوں نے اُٹھ کر ڈیوٹیاں بانٹ لیں اور پتا لگانے ادھر ادھر بکھر گئے۔

پہلی بار نور منیر کو احساس ہوا کہ وہ انتہائی بے بس اور تنہا ہو گیا ہے۔ وہ اپنے کمرے کی دیوار سے سر ٹکرا کر دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ پہلی رات ہے جدائی کی اور گل بانو کی نشانی سنبھال کے نہ رکھ سکا.....!

اُف ایک بچہ اس سے سنبھالا نہ جا سکا۔ اگر میرا منور منیر نہ ملا تو میں کیا کروں گا۔ کیسے جیئوں گا..... گل بانو کو کیا جواب دوں گا۔ یہ خیال آتے ہی وہ باہر کو لپکا گیراج میں اس کی چھوٹی سی سوزوکی کھڑی تھی۔ اس کو

سٹارٹ کیا اور باہر نکل گیا۔
باہر چودھویں رات کی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ دور دور پہاڑوں پر میدانوں میں..... کچے پکے گھروں کے اوپر اک اک چیز صاف نظر آرہی تھی۔ اس نے اپنی گاڑی کا رخ قبرستان کی طرف موڑ دیا۔ اس وقت سوائے گل بانو کے کوئی اس کا دکھ اور بے چینی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ یونہی اس کا ہاتھ غلطی سے ٹیپ ریکارڈ کو لگ گیا..... گیت ابھرنے لگا۔

چاندنی راتوں میں جس دم یاد آجاتے ہو تم
روشنی بن کر میری آنکھوں پہ چھا جاتے ہو تم

.....

گل بانو کو یہ گیت بہت پسند تھا۔ اس کی آواز بڑی رسیلی تھی اور اس کو چودھویں رات کی چاندنی سے بہت پیار تھا۔ ہمیشہ کہتی تھی چودھویں کی رات گھر آجایا کرو..... جب وہ نہ آسکتا تو جہاں بھی ہوتا اسے فون کرتا اور اس گانے کی فرمائش کرتا۔ وہ گھر کے کسی کونے میں چھپ کر اسے یہ گانا سنایا کرتی..... بلکہ اس کی آواز میں اس نے یہ گانا اپنے موبائل میں ریکارڈ کر رکھا تھا جب ڈیوٹی پر ہوتا یا چودھویں کو نہ پہنچ سکتا تو خود بھی یہ گانا سنتا تھا..... اپنی موٹر کے ٹیپ ریکارڈ پر بھی اس نے یہ لگا رکھا تھا
چاندنی نکھرتی رہی گیت بجتا رہا..... موٹر چلتی رہی..... وہ روتا رہا جس قدر کہ رو سکتا تھا۔ اب آنسوؤں کے سوا اس کے پاس تھا ہی کیا.....؟
قبرستان کے باہر اس نے گاڑی روکی..... چاندنی کتنی بے نیاز ہے۔ قبرستان کے اندر بھی اپنا جادو بچھا رکھا ہے۔ پتا نہیں ابد تک سونے والے اس کے سحر کو محسوس کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اس نے ذرا دور گاڑی کھڑی کی اور پیدل چلتا ہوا قبرستان کے قریب آگیا۔ چار دیواری کوئی نہیں تھی۔ شاید یہاں چوری یا رہزنی کا خوف نہیں ہوتا..... قریب آیا تو اس کا پاؤں کسی چیز کو لگا وہ اوپر قبروں کو دیکھتا آرہا تھا۔ ڈر کر نیچے دیکھا، تو وہاں ایک کتیا سو رہی تھی۔ اس کے سارے بچے اس کے سینے کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے اور کتنے اطمینان سے ماں کی گود میں سو رہے تھے۔ اس کا پاؤں لگنے سے وہ چونکی، ذرا سا غرائی اور اس نے دم ہلائی۔ مبادا وہ اس کے پلوں کو چھیڑے اور وہ جھپٹ کر اس پر حملہ کرے.....
وہ دور دور نظر دوڑا کر ان اونچی نیچی قبروں میں ایک تازہ بنی ہوئی قبر ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے ڈھونڈ لی۔ نہ جانے کیوں اسے یوں لگا کہ گل بانو کا ہاتھ قبر سے باہر ہے..... کیا یہ فریب نظر تھا..... ہیولا تھا..... وہم تھا..... یا روتی آنکھوں کا قصور تھا۔ وہ تیز تیز چلنے لگا۔ وہ گل بانو سے رو رو کر التجا کرنا چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا کہیں کھو گیا ہے۔ وہ اسے ڈھونڈنے میں اس کی مدد کرے.....
جونہی وہ قبر کے نزدیک پہنچا اسے لگا کہ ہاتھ قبر کے اندر چلا گیا ہے۔ پھر اس کی چیخ نکل گئی جب اس نے دیکھا کہ ننھا منور منیر ماں کی قبر سے لپٹ کر سو رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

آخری پندرہ سولفظ

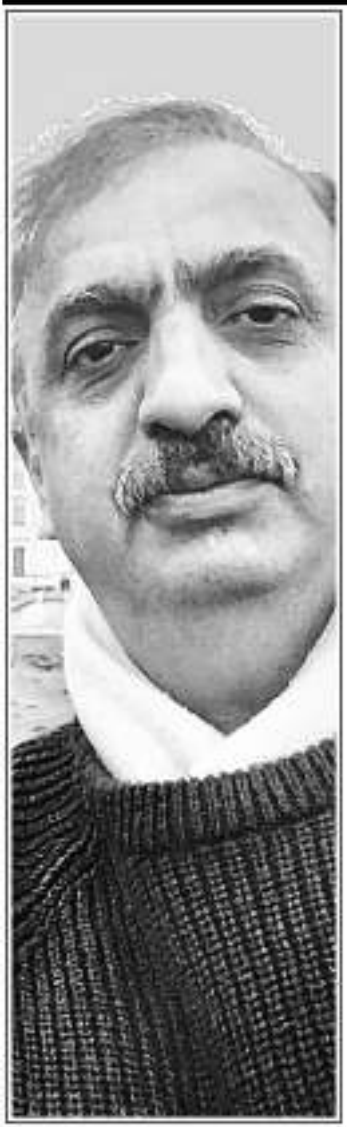

حبیب الرحمٰن

اگر آپ نے پرانا اسلام آباد نہیں دیکھا تو آپ جانتے بھی نہیں ہوں گے کہ کراچی کمپنی کے رہائشی علاقے اور پشاور موڑ کے درمیان ایک نالہ بھی ہے جس میں کبھی تازہ پانی بہا کرتا تھا۔ کراچی کمپنی سے پشاور موڑ جانے کے لیے لوگ اسی نالے کے درمیان دھرے پتھروں پر پاؤں رکھ کر پار جایا کرتے تھے۔ نالے کے کنارے لگے گھاس کے درمیان کھلے ہوئے جنگلی پھول پانی کے شور سے مدہوش ہوکر دھیرے دھیرے چلتی ہوا کے ساتھ ہلکورے لیا کرتے۔ شام سے کچھ پہلے جب نالے کے آس پاس علاقے میں کام کرنے والے مزدور اور دیہاڑی دار آکر بیٹھتے اور گپ شپ لگاتے تو بہتے پانی کا شور باتوں اور ماہیے کی آوازوں میں گم ہو جاتا۔ انہی مزدوروں میں مہرداد بھی شامل تھا جو اسی کی دہائی کے آغاز میں افغانستان سے مہاجر کی حیثیت سے پاکستان وارد ہوا تھا اور اب ایک افغانی ہوٹل پر کام کرتا تھا۔

مہرداد کا تعلق کابل کے کسی متمول خاندان سے تھا لیکن روسی فوجوں کی آمد سے انگریزی سکول کے ساتویں گریڈ میں پڑھتا مہرداد یتیم بھی ہو گیا اور در بدر ہوتا ہوا اسلام آباد

کے ایک ہوٹل پر بھی پہنچ گیا۔ سنہرے بالوں اور بلوریں آنکھوں والے مہرداد کی عمر یہی کوئی پندرہ سولہ سال ہوگی۔ مہرداد شام کے اوقات میں اسی نالے کے کنارے بیٹھ کر گزرے دنوں کو یاد کرتا اور دوپہر سے پہلے اور رات گئے جی نائن ون کے ایک افغانی ہوٹل پر کام کرتا اور وہیں بالآخر فرش پر بستر بچھا کر سو رہتا۔

اسلام آباد والوں نے اسّی کی دہائی میں افغانی کھابے پہلی دفعہ دیکھے تھے اور افغانی بھی۔ افغانی نان افغانی کباب کی شہرت ہوئی تو ہوٹل بھی چلنے لگا اور ہر ایک کو مسکرا کے انگریزی میں ویلکم کہنے والا مہرداد بھی جانا جانے لگا۔ وہی مہرداد جس کا کوئی بھی دنیا میں نہیں تھا فارسی اردو اور انگریزی جاننے اور بولنے کی صلاحیت کی وجہ سے پہلے بی بی سی کی ایک ڈاکومنٹری میں نظر آیا پھر سی این این اور بہت سے چینل پر نظر آنے لگا اور جلد ہی ایک این جی او (NGO) جو پاکستان میں افغان مہاجرین کے لیے کام کر رہی تھی مہرداد کو ایک اچھی تنخواہ پر اپنے ساتھ لے گئی۔ وہی مہرداد جو کچھ عرصہ پہلے ایک چھوٹے سے افغان ہوٹل پر کام کرتا تھا اب پشاور تہران اور واشنگٹن میں نظر آنے لگا۔

روسی فوجیں نوے کی دہائی کے اختتام پر افغانستان سے نکلیں تو مہرداد کی رسائی کابل تک ہوگئی۔ اسے ماں باپ کی قبریں تو نہ ملیں لیکن اپنے گھر تک پہنچ کر وہ کئی بار جیا اور کئی بار مرا۔ وہ کابل تک رسائی رکھنے والوں اہم مہروں میں سے ایک تھا جس کی پہنچ کابل واشنگٹن اور اسلام آباد تک تھی۔

اب مہرداد نے ایک مختصر سا کاروبار کابل میں ہی شروع کر دیا تھا اور اس کی بظاہر گزر بسر اسی کاروبار کی وجہ سے ہو رہی تھی۔

نائن الیون کے بعد اس کی اہمیت اور بڑھ گئی اور اب اس کے ساتھ بظاہر افغانی لگنے والا جارج کام کرتا جو رات کو اسی کے ساتھ فلیٹ میں رہتا۔ جارج ایک زندہ دل اور گپ شپ لگانے والا انسان تھا۔ وہ سارا دن اپنے کام میں مگن رہتا اور رات بھر فلوریڈا میں بیٹھی اپنی گرل فرینڈ سے گپیں ہانکتا۔ مہرداد کم گو تھا اپنے کام سے کام رکھتا لیکن اکٹھے رہتے وقت کے ساتھ ساتھ وہ ایک دوسرے کے دوست بنتے چلے گئے۔ وہ رات گئے کابل کی سڑکوں پر گھومتے کبھی کبھی کابل کے اکلوتے بار میں چلے جاتے اور رات گئے کابل کی برف باری میں گیت گاتے اپنے فلیٹ میں لوٹ آتے۔

مہرداد نے شادی نہیں کی تھی اور نہ ہی اس کا ارادہ شادی کرنے کا تھا لیکن جارج روائتی شادی نہ سہی لیکن زندگی جولیا کے ساتھ گزارنے کے سپنے ضرور بنتا اور واپس امریکہ جا کے جینا چاہتا تھا۔ ٹرمپ کے بعد جو بائیڈن کی حکومت آئی تو امریکی فوجوں

کی واپسی کی باتیں بھی ہونے لگیں۔ مہرداد اور جارج کو اگلے احکامات تک کابل رکنا تھا لیکن جب تمیں اگست ۲۰۲۱ تک امریکہ کے پلٹ جانے کی خبریں آنے لگیں تو وہ بھی نئے سرے سے منصوبہ بندی کرنے لگے۔

کابل کا اکلوتا کلب بھی بند ہوگیا اور طالبان کی مختلف شہروں پر قبضے کی باتیں بھی ہونے لگیں۔ دکان بند کرنا پڑی اور وہ دونوں فلیٹ تک محدود ہو کر رہ گئے۔ زندگی ایک دم سے بور ہوگئی اور بے یقینی ایک بار پھر مہرداد کی زندگی میں آگئی تمیں اگست سے پہلے کابل چھوڑنا ممکن نہ تھا امریکی فوج کے جانے اور طالبان کے آجانے کے بعد کی صورتحال کے بارے میں وہ دونوں سوچتے اور کڑھتے۔

تمہیں پتہ ہے کہ اس شہر میں ایک یہودی قسمت بتانے والا fortune teller بھی ہے -- ایک رات جارج نے مہرداد کو اطلاع دیتے ہوئے کہا —

وہ کیا کرے گا-- مہرداد نے پوچھا

بے یقینی کا خاتمہ --- جارج اداسی سے بولا— کم از کم وہ یہ تو بتائے گا کہ مجھے کب تک جینا ہے اور کیا میں زندہ واپس امریکہ پہنچ بھی پاؤں گا یا نہیں--

تم ایسی باتوں پر یقین رکھتے ہو مہرداد ہنستے ہوئے بولا

شاید نہیں جارج بولا-- لیکن مل کر اگر بے یقینی کچھ کم ہو تو ملنے میں حرج ہی کیا ہے

مہرداد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور کندھے اچکا کر خاموش ہوگیا۔

دوسری صبح مہرداد کو سوتا چھوڑ کر جارج منہ اندھیرے ہی پل چرخی کے علاقے میں مقیم ہاف مین (hoffman) کے پاس پہنچ گیا۔ ہاف مین اس سے پہلے روسی فوج کے واپس جانے اور امریکی فوج کے کابل میں ڈیرہ ڈالنے کی پیشین گوئی کر چکا تھا--

کیا چاہتے ہو درمیانی عمر کے ہاف مین نے اپنی خشخشی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا

چاہتا کچھ نہیں بس جاننا چاہتا ہوں کہ آنے والے دنوں میں میرا کیا بنے گا--

نام کیا ہے تمھارا-- ماں کا نام --- عامل جارج اس سے سوال پوچھتے ہوئے چھوٹے سے کاغذ پر جواب پر لکھتا رہا اور غیب کا علم اللہ کے پاس ہے کہتا ہوا قلم سے آڑھی ترچھی لکیریں کھینچتا رہا ---

جس طرح اللہ نے ہر ایک کی خوراک کا رزق لکھا ہوا ہے، مال اسباب اولاد لکھی ہوئی ہے -- کافی دیر خاموشی سے حساب لگانے کے بعد ہاف مین اپنی بات دوبارہ شروع کرتے ہوئے بولا --اسی طرح اللہ نے ہر انسان کے لیے لفظوں کا رزق بھی لکھا ہوا ہے--

جارج نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ---- لفظوں

کا رزق ---- دوبارہ کہتے ہوئے --- بات سمجھ نہ آنے کا عندیہ دیا اور استفہامیہ نظروں سے ہاف مین کی جانب دیکھنے لگا۔

لفظوں کا بھی رزق ہوتا ہے --- ہاف مین دوبارہ گویا ہوا اللہ نے رزق کی طرح ہر شخص کے لیے لفظوں کی تعداد بھی لکھ چھوڑی ہے جو اس نے عمر بھر بولنے ہیں --- مجھے علم نہیں کہ کابل طالبان کب پہنچیں گے امریکی انخلا ممکن ہو گا یا نہیں لیکن میں تمھارے بارے میں یہ جانتا ہوں کہ اب تمھارے پاس صرف پندرہ سو لفظ بولنے کے لیے رہ گئے ہیں --- ہاف مین نے ایک کاؤنٹر (counter) نما گھڑی تھماتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی جس پر ۱۵۰۰ کا ہندسہ جگمگا رہا تھا ---

پندرہ سو لفظ --- گھڑی پر پندرہ سو کا ہندسہ دیکھتے ہوئے جارج بولا تو کاؤنٹر ۱۴۹۷ کے ہندسے سے جگمگانے لگا

what the hell is this (یہ کیا بکواس ہے) جارج نہ چاہتے ہوئے بھی غصے اور خوف کے لہجے میں ایک بار پھر بولا تو کاؤنٹر ۱۴۹۳ کے ہندسوں کی روشنی سے منور ہو گیا۔

ہاف مین نے اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا اور یقین اور غیر یقینی کی کیفیت سے دوچار جارج کو خاموشی سے رخصت ہونے کا اشارہ کر دیا۔ جارج بھی اب مزید کوئی لفظ ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا وہ بھی بغیر کچھ بولے خاموشی سے گھر کی جانب چل دیا۔

واپسی پر مہرداد اس کا استقبال کرنے کے لیے موجود تھا لیکن جارج ہاف مین پر یقین نہ ہونے کے باوجود وہ مزید لفظ ضائع نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ مہرداد کے شدید اصرار پر اس نے مختصر ترین لفظوں میں اپنی کتھا سنائی تو مہرداد ہنسنے لگا۔ جارج کے کاؤنٹر پر لفظ مزید کم ہو گئے تھے اور خوف اس کی آنکھوں سے چھلکنے لگا تھا۔

وہ مہرداد کو یقین دلانے کے لیے مزید لفظ ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ سر پر تکیہ رکھ کر چپ چاپ ہو کر لیٹ گیا۔

وہ شام جارج کے لیے بہت تکلیف دہ تھی جولیا کی آنے والی کال اس نے چاہتے ہوئے بھی نہ اٹھائی وہ اگر اسے اپنا دکھڑا سناتا تو وہ اسے وہمی گردانتی اور لفظ مزید کم بھی ہوتے۔ اس نے عامل کے کہے گئے لفظوں کو بھول کر فون کرنے کا ارادہ بھی کیا لیکن وہ کال نہ کر سکا۔ شام کو جولیا کا وائس نوٹ (if you dont love me dont call me) ملا۔ اس نے i love you کا جوابی پیغام تو بھیجا لیکن فون نہ کیا لیکن رات ڈھلے بار بار آنے والی کال کو اسے اٹھانا ہی پڑا۔ لڑتے سنبھلتے اس نے بیمار ہونے کا بہانہ کیا اور مختصراً اپنا دکھڑا بھی سنایا لیکن اس کارروائی میں وہ مزید چار سو لفظ اُڑا چکا تھا۔

آنے والے کچھ دن اور راتیں اس نے آنکھوں میں کاٹتے اور اس وہم کو جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے گزارے --

طالبان مختلف شہروں پر قبضہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور غیر ملکیوں کا مستقبل غیر یقینی نظر آ رہا تھا۔ وہ خبریں دیکھتے ہوئے مہرداد سے بات کرنا چاہتا لیکن لفظوں کو گن کر چپ ہو رہتا۔

اگست کے آخری دن آ گئے۔ اداسی بہت بڑھی تو جارج سے مہرداد نے باہر چلنے کو کہا-- مہرداد جانتا تھا کہ جارج کو بابر کے مزار اور اس سے متصل باغ اچھا لگتا ہے وہ اسے لے کر باغ ابر پہنچا تو ہلکی دھوپ اور نرم ہوا کتنی ہی دیر ان دونوں سے لپٹی رہی -- مہرداد باتیں کرتا اور جارج خوف اور لفظوں کی قلت کے باعث چپ کر کے اسے دیکھتا اور کبھی کبھی ہوں ہاں کر دیتا قرنہ جھیل پر چلتے ہیں--- بہت دیر باغ میں بیٹھنے کے بعد جارج نے مہرداد کے بازو تھامتے ہوئے کہا

مہرداد نے کوئی جواب نہ دیا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ بابر کے مزار سے جھیل آدھے پونے گھنٹے کے فاصلے پر تھی۔ یہ سفر جارج نے کار کی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے خاموشی سے کاٹ دیا۔ جھیل پر عام حالات سے رونق کم ضرور تھی لیکن کچھ خاندان اور بہت سے منچلے وہاں ضرور موجود تھے---

وہ دونوں کچھ دیر جھیل کے کنارے بیٹھ کر ہلکی ہلکی ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جھیل میں چلنے والی کشتیاں دیکھتے رہے۔

میں اس خوف میں اور نہیں جی سکتا--- جارج کلائی سے بندھے کاؤنٹر سے کھیلتے ہوئے بولا۔

تمھارے وہم کی جڑ یہ کاؤنٹر ہے --- مہرداد جارج کے بازو سے بندھے کاؤنٹر کو کلائی سے اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا جو اس کا ہاتھ جھٹک کر جھیل کی جانب بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا

جارج-- مہرداد تلخی سے بولتے ہوئے اسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے گھڑی نما کاؤنٹر کے درمیان اڑسی ہوئی انگلیوں کے ساتھ کھینچتا ہوا بولا ---

کاؤنٹر پر اب آخری دس ہندسے سرخ رنگ کے ساتھ تیزی سے جل بجھ رہے تھے

جارج نے ایک بار پھر مہرداد کا ہاتھ جھٹک کر چھڑانے کی کوشش کی تو کاؤنٹر بازو سے کھل کر مہرداد کے ہاتھ میں آ گیا۔ مہرداد نے ہاتھ میں آیا ہوا کاؤنٹر زور سے جھیل کی جانب پھینکا اور کلائی چھڑا کر جھیل کی جانب تیزی سے بھاگتے ہوئے جارج کی جانب بڑھا جو اس کے پاس پہنچنے سے پہلے جھیل کے گہرے پانی میں چھلانگ لگا چکا تھا --

☆☆☆☆☆

ڈبو

نجم رضوی

جنوری کی شدید دھند کے بعد فروری کی سنہری اور خوشگوار دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ہر چیز نکھری نکھری اور اُجلی اُجلی لگ رہی تھی۔ دھوپ کی تمازت سے پچھلے دنوں کی جکڑن سے رہائی پا کر میں سکول کی چھت پر آ گیا۔ سکول کی چھت پر کھڑا ہو کر اِردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ شرقپور خورد کی چالیس پچاس ہزار کی قدیم آبادی میرے سامنے تھی۔ سادہ اور درمیانے درجے کے مکانات سینہ تانے ایک دوسرے کے سامنے اکڑے کھڑے تھے تین اور چار منزلہ مکانات اِکا دُکا ہی تھے۔ اس آبادی کی نسبت کم چوڑا بازار، لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور سڑک کی دوسری جانب کوٹ عبدالمالک کی تاریخی آبادی میرے سامنے تھے۔ ایک سکیم اور پلاننگ سے آباد قصبہ، جس کے بڑے بڑے بازار اپنے نام کی لاج رکھے ہوئے تھے۔ اس ٹاؤن کی آبادی بھی کوئی ساٹھ ستر ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ ایک تو یہ فیکٹری ایریا ہے، مختلف جگہوں سے آئے مختلف لوگوں کی آماجگاہ اور دوسرے معاش کے لیے ایک بہتر جگہ اور یہ اڈا دونوں یونین کونسلوں کے

لیے ایک کاروباری سنٹر ہے۔ سڑک نے ان دونوں قصبوں کو انڈر لائن کر کے جدا کر رکھا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر یہ اڈا لوگوں کی مصروفیات کا مرکز ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر میں چھت کے سامنے جنگلے پر جھک گیا۔ میری نظریں سامنے دو رویہ سڑک پر مرکوز ہو گئیں۔ میرے سامنے سڑک پر دونوں جانب ٹریفک کا منہ زور سیلاب رواں دواں تھا۔ جسے دیکھو سڑک پر گاڑی دوڑائے چلے جا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے ہر کسی کو کہیں پہنچنا ہے اور یقیناً وہ لیٹ ہو گیا ہے۔ گزرتی ہوئی یہ گاڑیاں، کوئی دائیں سے گزرنے کی کوشش کر رہا ہے تو کوئی بائیں طرف سے۔ پہلی گاڑی دوسری کو اور تیسری گاڑی اس ہی وقت دوسری گاڑی کو اوورٹیک کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کبھی کبھار جب یہ رش بڑھ جاتا اور گاڑیوں کی سپیڈ سست پڑ جاتی تو اس منہ کھولے اژدھا کی موجودگی میں سڑک پار کرنا انتہائی دشوار ہو جاتا۔ سامنے، فٹ پاتھ پر کب سے کھڑی ایک ماں سڑک پر سے گزرنے کے لیے کبھی ایک بچے کا ہاتھ پکڑتی تو دوسرا بازو چھڑانے کی کوشش کرتا۔ وہ اس کشمکش میں کبھی ایک بچے کو ڈانٹتی تو کبھی دوسرے کو صلواتیں سنانے لگتی۔ وہ کبھی ایک پاؤں سڑک پر رکھتی اور کبھی دوسرا۔ اسی اثنا میں کوئی رکشہ شور کرتا ہوا اس کے پاؤں کے قریب سے گزر جاتا۔ ڈر کر وہ پاؤں پیچھے گھسیٹ کر فٹ پاتھ پر آ کھڑی ہوتی۔ بچوں کے ساتھ سڑک عبور کرنے میں یہی قباحت ہے کہ ماں جیسے ہی آگے کو سرکی، اور بچے بھی ماں کی پکڑ میں نا ہوں، تو وہ ٹریفک نہیں دیکھتے، ماں کے آگے جھکے جسم کی جنبش سے آگے لپکتے ہیں اور سڑک عبور کرنے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں، چاہے ماں کسی گاڑی سے ڈر کر پیچھے کی طرف ہٹ جاتی ہے۔ سڑک کیا تھی، پل صراط تھی جسے پار کرنا آسان نہیں تھا۔ قصبے کا یہ اڈا عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔ ہر طرف شور ہی شور تھا۔

''پی..... پاں..... پوں.....''

میں چھت سے اترا اور بیس پچیس قدم چل کر سڑک کی دوسری طرف میڈیکل سٹور سے دوائی لینے چل پڑا۔ سروس روڈ جسے لاکھوں روپے سے تعمیر کیا گیا ہے، وہاں ہر طرف ریڑیاں، گدھا گاڑیاں، موٹر سائیکل رکشے، بے جا رکشہ سٹینڈ، سائیکل سوار، سبزی اور پھلوں کی ریڑیاں اور سونے پہ سہاگہ، آگے پیچھے سے گزرتے یہ شیطانی چرخے۔ ایک سڑک کراس کر کے میں دونوں سڑکوں کے درمیان فٹ پاتھ پر کچھ دیر کھڑا رہا۔ میں دوسری طرف جانا چاہتا تھا۔ لیکن وہی شہر کے قریب کی ٹریفک جیسے ہی گاڑیاں شہر کے رش سے نکلتی ہیں ہوا سے

باتیں کرنے لگتیں۔ زیادہ تر ڈرائیور ٹریفک نشانات کی پروا کیے بغیر، صرف ہارن پر تکیہ کیے، اسی سپیڈ سے گنجان علاقے میں گزر رہے تھے۔

میں نے گوشت والے بازار کے سامنے سے سڑک پار کی۔ میری نظر سامنے گئی۔ کتے کا ایک بچہ بڑی شان بے نیازی سے گوشت والے بازار سے نمودار ہوا اور سڑک کی طرف آنکلا۔ وہ موٹا تازہ پانچ چھ ماہ کا سفید پلہ تھا۔ اس پر گوشت پوست بھی خوب چڑھا ہوا تھا اور یہ محسوس ہوتا تھا اس کو ماں کا دودھ چھوڑے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہوئے کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ وہ اتنا ناسمجھ تھا کہ اسے نہیں پتا تھا کہ وہ بازار سے باہر کیوں نکل آیا ہے، کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔ اس کے کان پر، آنکھوں سے نیچے، پشت پر اور ٹانگ پر چھوٹے چھوٹے سیاہ دھبے تھے۔ اس کی دم بالکل سفید اور دائرہ میں مڑی ہوئی تھی۔ یہ بل یا گلیئر کی نسل سے تو نہ تھا بس لوکل اور دیسی کتوں کی نسل میں سے تھا اور پالتو بھی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ شاید کسی نے اس کا نام ڈبو رکھا ہو یا ہی۔ چلیں ہم اسے ڈبو ہی کہہ لیتے ہیں۔

جہاں جوانی کا زمانہ طاقت ور، منہ زور اور کڑا ہوتا ہے وہاں بچپن کا زمانہ موج مستی، لاپرواہی، خود مختاری اور معصومیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ڈبو گوشت والے بازار سے دوڑتا سڑک پر آنکلا۔ اسی شان بے نیازی سے، ٹریفک سے لاتعلق، ٹریفک کے قوانین سے نابلند، سڑک کے کنارے کنارے جس طرف سے ٹریفک آ رہی تھی اس سمت بھاگنے لگا۔ اس کی چال میں اٹکھیلیاں اور لاڈلا پن گندھا ہوا تھا۔ لاابالی طبیعت کے سبب وہ کبھی کبھار سڑک کے کنارے چلتے رک کر اِرد گرد کی مٹھائی کی دکانوں کو دیکھنے لگتا اور کبھی کسی کی آواز سن کر دم ہلانے لگتا۔ ایک دکاندار نے اس کی طرف کھانے کا نوالا پھینکا..... اُدھر ایک شرارتی لڑکے نے اس کی طرف کنکر پھینکا، ڈبو بدک گیا..... وہ دوڑا ..... ایک سائیکل سوار سے جا ٹکرایا، گرا، اُٹھا..... اور پھر اندھا دھند بھاگا۔

ڈبو، سروس روڈ پر لوگوں کے لیے بنی چھوٹی گزرگاہ سے سڑک پر آ گیا..... سڑک پر تین چار موٹر سائیکلیں شور کرتی اس کے قریب سے گزر گئیں..... وہ بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگا..... ایک موٹر سائیکل سے ٹکراتے ٹکراتے بچا..... حواس باختہ، ہانپتا ڈبو، کبھی سڑک کے ایک طرف بھاگ رہا تھا تو کبھی دوسری طرف..... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جائے..... یا کیا کرے..... اس وقت سڑک پر ٹریفک کا زور کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ ذرا، سہما، ڈبو سڑک کا

کنارہ چھوڑ کر ترچھی سڑک عبور کرنے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا...... سامنے سے چھوٹا شہ زور مزدا ٹرک آ رہا تھا- وہ ڈبو سے تقریباً بیس بائیس قدم کے فاصلے پر تھا اور اس کی رفتار بھی بہت زیادہ نہیں تھی اور ڈرائیور نے ڈبو کو سڑک کراس کرتے دیکھ بھی لیا تھا- اس نے ڈبو کو بچانے کے لیے بریک لگانی شروع بھی کر دی تھی- ڈبو تک پہنچتے پہنچتے اس کی رفتار بہت کم رہ گئی تھی- اسی اثنا میں ڈبو ٹرک کے اگلے ٹائر کی سیدھ میں آ گیا- جیسے ہی ٹائر آگے سرکا، ڈبو ٹائر کی لائن سے تھوڑا سا آگے سرک گیا- ٹائر ڈبو کی طرف بڑھا لیکن وہ ٹائر کی سیدھ میں نہیں تھا، اس کی پشت پر ٹائر کے ربر کی ہلکی سی ٹھوکر لگی، وہ سڑک کے درمیان کی طرف گرا- وہ ایسے چونکا جیسے کسی نے اس سے چھیڑ چھاڑ کی ہو- وہ سڑک سے چونکتے ہوا اُٹھا اور ٹرک کے اگلے ٹائر اور اپنی طرف لڑھکتے پچھلے ٹائر کے درمیانی فاصلے میں سے گزرنے کے لیے، پھر سڑک کی ایک طرف جانے کے لیے مڑا- اسی لمحے پچھلا چوڑا ٹائر اس کے قریب آ گیا...... جب ڈبو تھوڑا سا آگے بڑھا، پچھلا ٹائر اس کے پچھلے حصہ پر چڑھ دوڑا......سڑک کے شور میں ایک ہلکی سی چیخ اُبھری اور فضا میں بکھر گئی...... ٹائر آگے سرک گیا......خون کا ننھا سا چشمہ پیچھے چھوڑ گیا...... ڈبو کا پچھلا حصہ سڑک سے چپک گیا...... سڑک پر تھوڑا سا خون پھیل گیا، ''چٹوں...... چاؤں...... چاؤں......'' کی آواز گراف نیچے کرنے لگا- چند لمحوں کے بعد پیچھے آتی بڑی گاڑی...... تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی...... بڑی گاڑیوں کے لیے تو سڑک پر پڑی چیز نقطہ کی طرح ہوتی ہے- اور چھوٹے نقطے کہاں دکھائی دیتے ہیں...... وہ اس کے اوپر سے گزر گئی- یہ سب اناً فاناً ہو گیا کوئی بھی اس کی طرف نہ بڑھ سکا......شاید موت کے خوف سے...... یا...... لاتعلقی ہے-

تھوڑی دیر بعد وہی ٹریفک کا سیلاب بہہ نکلا، جیسے کچھ ہوا ہی نا ہو- سائیکل سوار کو ٹریکٹر ٹرالی پاس کر رہی تھی تو اس کو اور بس کو تیز رفتار کار، جیسے دیکھا دیکھی اپنی اپنی گاڑی اندھا دھند ایک دوسرے کی تقلید میں دوڑائے جا رہا تھا- تھوڑی دیر بعد وہاں سڑک پر خون کے مدھم سے خون کے دھبوں کے علاوہ کچھ نہ تھا...... چند کوّے اوپر منڈلا رہے تھے......ڈبو ٹائروں سے چپک چپک کر ختم ہو گیا تھا-

سڑک پر پھر وہی شور تھا، ''پی...... پاں...... پوں......''

☆☆☆☆☆

کل کھیل میں ہم ہوں نا ہوں

چہرہ اپنے تمام درد چھپائے، رنگ و روغن سے منور مگر خالی گہری آنکھیں رنگوں میں چھپا ہوا وجود مگر رنگ برنگے اور شوخ لباس کے پیچھے جھریوں بھرا تن، بے سرو پا لباس، سر پر ایک ترچھی پھول دار ٹوپی، ہاتھوں پر سفید رنگ کے بوسیدہ دستانے اور جھکا جھکا نحیف وجود ایک جوکر کی پہچان ہوا کرتا ہے جوکر لفظ کہاں سے آیا، کیسے نکلا، کب وجود میں آیا ہر کوئی جانتا ہے مگر جوکر کلاکار سے مذاق کب بنا اس پر تاریخ خاموش اور ساکت ہے۔

اس کا اصلی نام حقیقی چہرہ شاید اسکو خود بھی یاد نہیں تھا۔ بچپن اور لڑکپن کے وہ دن اسے آج بھی یاد تھے جب پہلی بار اس نے جوکر کا تماشا دیکھا تھا۔ سب کو ہنساتا، سب کے لبوں پر مسکان لانے والا جوکر اس نے اپنے دل میں بسا لیا تھا۔ گھر کی غربت اور ماحول کی سنگ دلی کے باعث تعلیم کا تو اس کے گھر میں گزر ہی نہیں تھا لیکن اس نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ کسی بھٹے پر اینٹیں نہیں اُٹھائے گا بلکہ اسے تو اپنے من کی مراد حاصل کرنا تھی۔ اسے جوکر بننا تھا۔ گھر کی کھچ کھچ سے وہ کب گھر بار چھوڑ بھاگا اور جوکر کے کھیل کا حصہ بنا یہ بات اسے کل کی لگتی تھی مگر اس کے بالوں کی چاندی چہرے کی جھریاں، پتلی بے جان آواز اور جھکا وجود اس کے گزرے ماہ و سال کی الگ ہی داستان سناتا تھا۔

شروع کے دن بڑے دلآویز تھے وہ روزانہ ہی کچھ نیا سیکھتا۔ بچے اسے دیکھ کر قہقہے لگاتے تو اسے لگتا اس نے جیسے کائنات کی تمام ابدی خوشیاں سمیٹ کر اپنے دامن میں بھر لی ہوں۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پہلے سے موجود تجربہ کار جوکر اس کی آمد کے بعد ہمیشہ افسردہ کیوں رہنے لگے تھے۔

وہ اسے اپنے بچوں کی طرح تیار کر رہے تھے۔ اس کے اندر بھی اپنے شوق کو لے کر ایسا جنون تھا کہ وہ دیکھنے والوں کے دل جیتتا چلا جاتا۔ اس کا رنگ اس قدر نکھر گیا تھا کہ وہ اپنے گروپ کا کم عمری میں ہی سالار بن گیا تھا۔ مالک اس کے کام شوق جنون اور لگن سے بہت خوش تھے۔ لیکن اسے تو بس دھن تھی کہ کیسے لوگ اسکو دیکھ کر تالیاں بجاتے ہیں۔ وہ بچوں کا سب سے پسندیدہ کردار تھا۔ اس کی تنخواہ سب سے کم مگر کام سب سے معیاری تھا۔ اس کو پیسے کی کبھی خاص ضرورت ہی نہیں تھی۔ نہ گھر تھا نہ کہیں

مرزا صہیب اکرام

آنا جانا ہوتا بس سرکس ہی اس کا گھر تھا۔ یہاں کے تمام فنکار اس کا کنبہ۔
اس لیے اس کے پاس برسوں بعد بھی تن ڈھانپنے کے علاوہ کوئی اسباب نہیں تھے۔ وہ جو کماتا اسکو اپنے ہی شو میں کام کرنے والے مختلف غریب اداکاروں میں کسی نہ کسی بہانے تقسیم کر دیتا۔
چاچا جوکر اسے اکثر کہا کرتا تھا میں تم میں اپنی جوانی دیکھتا ہوں۔ لیکن یہ بات کہتے ہوئے چاچا کہیں کھو سا جاتا۔ چاچا جوکر اس سرکس میں ہر دل عزیز ہوا کرتا تھا۔ اس کے نام پر ٹکٹ بکا کرتے تھے۔ اس میں کام کا ایک جنون ہوا کرتا تھا۔۔ جب وہ اس ننھے فنکار کو جان مارتے دیکھتا تو اس کو اپنے شب و روز یاد آ جاتے، مگر وقت کے ساتھ ساتھ وہ چپ چپ بھی رہنے لگا تھا۔ جیسے کوئی بات اندر ہی اندر چاچا جوکر کو ختم کر رہی تھی۔
پھر ایک دن اس کا جوکر چاچا اچانک غائب ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے اندھیرے میں جلتا دیا بجھ گیا ہو۔ کٹیا میں اب روشنی کا گزر نہیں تھا۔ اس دن اس نے سب سے پوچھا کہ چاچا کہاں ہے۔ میرا استاد میرا سب کچھ ایسے کیسے جا سکتا ہے۔ اس نے ہر چہرے پر لکھی خاموش عبارت پڑھنی چاہی مگر وہ نہ سمجھ پایا کہ اس اندھی بستی میں ادارے پر آئے وزنی بوجھ یونہی چپ چاپ اتار دینے کا رواج بہت پرانا ہے۔ چاچا بھی کبھی

کسی کو روند کر اس جگہ پہنچا تھا۔ اب چاچا کی جگہ اس کے اس کے ہونہار شاگرد نے لے لی تھی جو خود بھی نہیں جانتا تھا کہ اس نے اپنے محسن کے منہ سے نوالہ چھین لیا ہے۔
اس رات وہ دیر تک روتا چلا گیا۔ اسے آج اپنوں کے کھونے کا غم سمجھ آیا۔ تب ماں باپ یاد آئے، وہ سب آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا جو زمانے کی رفتار نے اس سے چھین لیا تھا۔
پھر تو چند برسوں میں کئی نئے فنکار آئے اور بہت سارا بوجھ کشتی سے اتار پھینکا گیا۔ تب اس کو وقت نے بہت سارے سوالوں کے جواب دینے شروع کیے۔ اب دوسروں کو ہنسانے والا چپ چپ رہنے لگا تھا۔ وہ مایوس اور بے جان چہروں پر خوشی لا کر سکون محسوس کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن ہر رات اس کے سامنے اس کے بہت سے اپنے آ کر کھڑے ہو جاتے۔
اس کی زندگی کی ناؤ عجیب سے منجدھار میں اٹک گئی تھی اس کی زندگی کے گزرے تمام ماہ و سال ایک ایک کر کے اس سے وہ سب چھین رہے تھے جن کو دیکھ کر وہ جوان ہوا تھا اور پھر جوانی کا سفر اس کے بڑھاپے کی جانب منہ زور گھوڑے کی طرح بھاگا تھا۔
جوانی کے عروج اور شباب کے دنوں میں اس نے اپنے اس خانہ بدوش خاندان کی دلدل میں کھلے ایک پھول کو دل سے چاہا تھا۔ ممکن تھا وہ اسے پا لیتا لیکن جوکر کا نمبر تو

ہر شو میں دکھ سہہ کر مار کھا کر آنسو بہا کر قہقہوں کی بہار لانے کا ہوتا ہے۔ ساری زندگی سرکس میں نبھایا پارٹ آخر اسکو حقیقت میں بھی تو ادا کرنا تھا۔
اس لیے اس کی زندگی اور تاریک خوابوں کو روشن کرنے کی واحد امید اس کے سامنے کسی دوسرے خیمہ کی زینت بن گئی۔
اس دن والے شو میں اس نے دیکھنے والی ہر آنکھ کو ہنسا ہنسا کر رلا دیا تھا۔ لوگ والہانہ قہقہے لگا رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے ہنستے ہوئے آنسو جاری تھے۔ اس دن جیسا شو بہت ہی کم دیکھنے والوں کی آنکھوں نے دیکھا تھا۔
اس دن کی رات کے بعد اس کو ہر جوکر کے درد، خاموش آنکھوں کی ویرانی اور بے جان چہروں کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آنے لگا تھا۔
جوکر چاچا جوکر چاچا کی آوازیں سن کر اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ تمام خانہ بدوش بچے اسے اپنے لگتے۔ وہ شو کے بعد بچوں میں رہتا۔ اپنے گزرے تلخ ایام کو بھلا کر کچھ دیر کے لئے سکون کی بے پایاں دولت حاصل کرتا۔ وہ اب تمام دکھوں کو پی کر تکلیفوں سے بے نیاز تھا۔ اس کی جمع پونجی اس کی کل کمائی صرف وہی تھی جو لوگوں کے ذہن میں اس کے لئے محبت تھی۔ وہ اسی محبت کے سہارے اپنی منزل کی جانب چلا جا رہا تھا۔
ایک دن ایک نیا جوکر جب گروپ میں شامل ہوا اسے لگا جیسے اسکی جوانی لوٹ آئی ہو۔ اس نئے جوکر کا جذبہ شوق اور جنون اسے اپنے دن یاد دلاتا۔ اسے اپنی جوانی اپنے سامنے نظر آنے لگی۔ نئے جوکر کی تربیت اس نے اپنے بچے کی طرح کی۔ اس نے برسوں کا کام دنوں میں سکھا دیا۔
نئے جوکر کو سکھاتا سکھاتا کب وہ شو میں نمبر دو بنا اسکو پتا ہی نہیں چلا۔ اب بچے اس کی پرانی گھسی پٹی روایتی حرکتوں پر ہنسنا چھوڑ چکے تھے۔ اس کے پاس اب کرنے کو کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ اسے گزرے ماہ و سال کا ایک ایک لمحہ یاد آ رہا تھا۔ چاچا جوکر کی یاد اس کی محبت کی یاد، بچوں کے دمکتے چہرے اسے سب کچھ دھندلا محسوس ہونے لگا تھا۔
اس کے تمام تشنہ سوال سیراب ہو چکے تھے۔
پھر ایک دن مالکوں کا بلاوا آیا اور اسے پتا چلا کہ اسکو آج آخری بار اپنا کرتب پیش کرنا ہے اور اس کے بعد وہ اس دنیا سے جا سکتا ہے۔
وہ رات صدیوں پر بھاری تھی۔ وہ سونے کے لیے لیٹا تو اس کے سامنے پانچ سال کا بچہ آ کھڑا ہوا جس نے بچپن میں ہی بغاوت کی تھی۔ اسے اپنی ماں یاد آئی۔۔ غربت اور بھوک کے دنوں میں بس ماں ہی تھی جو اس کو سینے سے لگا کر ظالم دنیا سے بچانا چاہتی تھی۔ مگر وہ ماں کے ساتھ جی ہی کتنا سکا تھا۔ آج ماں بے حساب یاد آ رہی تھی۔
اس کا باپ اس کے لئے بہت سخت گیر انسان تھا۔ مگر آج تو وہ بھی یاد آ رہا تھا۔

اسے یاد تھا کہ باپ اسے کبھی کبھی بہت ڈانٹ دیا کرتا تھا بلکہ اکثر مار بیٹھتا تھا مگر بعد میں بہت پریشان ہو جایا کرتا تھا بچپن میں باپ اس کو جلاد اور ڈھونگی لگتا تھا مگر وقت دوری اور حالات نے سبق دیا تھا باپ آخر باپ تھا۔ وہ اپنے دائرہ میں مجبور تھا ورنہ بیٹے کے لئے محل بنوا دیتا۔ بہن بھائی یاد آئے۔ اس نے یہاں تک آتے ہوئے کیا کچھ دان کیا تھا کیا کیا کھو دیا تھا۔ جس رات گھر سے بھاگا تھا ماں بیمار تھی مگر اس کو اینٹوں کا خوف ایسے لاحق تھا کہ وہ بس بھاگ نکلا تھا۔ اور ایسا بھاگا تھا کہ اسے یاد ہی نہیں تھا وہ کسے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ آج جب اسے وقت ملا تو وہ ماضی میں کھو گیا تھا۔ اس کا سرکس میں پہلا دن، پہلا شو اسے آج بھی یاد تھا۔ چاچا جوکر کی محبت اس کا بڑا پن اور آخری آنسو وہ سب کا گواہ تھا۔ اس نے پہلی محبت یہیں کی تھی اور پہلی ناکامی بھی یہیں دیکھی تھی۔

مگر وہ اپنے کام میں ایسا مگن تھا کہ بس اس ہر دکھ کو جوکر کے لبادے میں چھپا لیا کرتا تھا۔

اگلی شام روشنیاں چار سو پھیل چکیں تھیں۔ جوکر کے آخری شو اور خاص انداز کا مائیک پر چیخ چیخ کر اعلان ہو رہا تھا۔

آج کا شو اسکی زندگی کا یادگار شو تھا۔ اس نے مدت بعد دل کھول کر ہر وہ کام کیا جو اسکی پہچان تھا۔ لوگ ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے تھے۔ جوکر چاچا کا اپنے بھتیجے سے مکالمہ جاری تھا۔ آنکھوں میں آنسو، لبوں پر مسکان سجائے جوکر اپنی دھن میں اپنا آپ امر کر رہا تھا۔

کیا کہا جوکر مرے تو کیا ہوتا ہے لوگ روتے ہیں۔ ہاں دیکھو ایسے روتے ہیں۔ یہ بول کر وہ اونچی آواز میں رونے لگا۔ سب حیران تھے یہ مکالمے اور پارٹ شو کا حصہ نہیں تھا۔

وہ اونچی اونچی رو رہا تھا اور اسکی ناک جو جوکر کی پہچان ہوتی ہے اس سے پانی فوارہ بن کر نکل رہا تھا۔ بچے ہنس رہے تھے۔ دیکھنے والے فن کا عجیب نمونہ دیکھ رہے تھے کہ موت پر بھی ہنسا جا سکتا۔

پھر وہ گرا۔ دیکھنے والے زمین پر پڑے جوکر کی ناک سے لال رنگ اور پانی اُبلتا دیکھ رہے تھے۔

او دیکھو میرے بچو جوکر ایسے مرتا ہے۔

مصنوعی ناک سے پانی جاری تھا۔ لوگ لوٹ پوٹ ہوتے بیوقوف جوکر کو دیکھ کر ہنس ہنس کر ہلکان ہو چکے تھے۔ سب کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے لیکن ہنسی جاری تھی۔

پردہ گرا۔

لیکن جوکر چاچا اپنا شو تو کب کا مکمل کر کے خاموش سے ہنستے ہنستے ابدی نیند سو چکا تھا۔

جوکر کی کہانی جاری تھی۔ لیکن ہر جوکر رو رہا تھا۔ کیونکہ کہانی کا سفر کہاں رُکتا ہے۔

جوکر آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں لیکن تماشا جاری رہتا ہے۔

☆☆☆☆☆

بے سمت مسافر [مائیکروفکشن]

باہر اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور اندر سناٹے کی آمریت مستحکم ہوتی جا رہی تھی۔ شام دھواں ہے یا دھند، کون بتاتا؟ پتلوں سے بینائی اور قوتِ گویائی چھین لی گئی تھی اور شاید محصور تمناؤں نے دہلیزِ وقت پر سر پٹخا تھا۔ افق کے کنارے خون میں تر ہو گئے تھے ۔ یکدم ہی شام مانگ میں سندور بھر کر بھی کسی بیوہ کی آنکھوں کی طرح ویران اور اداس لگنے لگی تھی۔

''کاش!! ایک لمحے کے لیے ہی سہی نالہ وشیون کی صدا بلند ہوتی۔'' میری ترستی سماعتوں نے خواہش کی مگر میں روشنی، رونق، چہرے اور لہجے سب کہیں پیچھے چھوڑ کر آگے نکل آیا تھا، بہت آگے۔ جہاں اطراف میں صرف سفید بت بنے اشجار تھے کوہساروں کی چوٹیاں پرانے کھنڈروں کی کفن پوش روحوں کی طرح گھیرا تنگ کرتیں میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ رات کے دکھ سے لاعلم، ڈوبتے سورج کا آخری منظر دھیرے دھیرے میری رگوں میں انہونی کا زہر گھول رہا تھا۔ اچانک مجھ پر کھلا کہ انجانے میں ہی سہی میرے قدم چوتھی جانب آ نکلے ہیں، جہاں دستور کے مطابق خود بخود کھلتے طلسمی در فقط ایک بار ہی وا ہوتے ہیں۔۔

تقدیر کا پُر کارروائی کے لیے وقت کے انتظار میں تھا۔ اور اک میں تھا کہ وقت ہی میسر نہ تھا۔

مہلت قلیل ہے اور شوقِ محبت میں خواہشوں کے سلسلے طویل!

''ہائے!! میری محبت'' کوئی میرے اندر بولا۔

''رات کب ختم ہوگی؟'' تانیہ نے مجھ سے پوچھا۔

''سو جاؤ''۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا!!

میں اسے کیسے بتاتا کہ سرد رویوں کی شدت ہی نہیں، سرد موسموں کی شدت بھی قاتل ہوتی ہے۔ کیسے کہتا؟ میں نے ماتم کرتی شام کی نوحہ نما سرگوشیاں سن لی تھیں، مجبور مسافروں میں ہمارا نام بھی شامل تھا۔

یہ بتانا اسے ضروری بھی نہیں تھا کہ کبھی کبھی دن نہیں بھی نکلتا، رات کے بعد بھی ایک طویل اور ابدی رات ہوتی ہے۔ اور ایسا تب ہوتا ہے جب دورانِ سفر خبر ہو کہ

''یہ راستہ کوئی اور ہے۔''

لمبا چوغہ پہنے خاموش خدمت گار اشارے سے مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ سمے کے اس پار قدیم قہوہ خانے کی چمنیوں سے اٹھتے دھوئیں پر مجھے اپنے ہیولے کا گماں ہوا۔

یکلخت نئی دنیا کی ایک نئی پرہجوم بستی میں ہمارا استقبال کیا گیا۔

شکر ہے تانیہ کا ہاتھ ابھی بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ لیکن یہ کیا ہم دونوں بے جسم تھے ہاں لیکن بے لباس نہیں تھے۔۔

لیکن یہ کیسا لباس تھا جسے کوئی بھی دیکھ نہیں پا رہا تھا پھر بھی سب عیاں تھا۔

واہ رے رستے واہ ری منزل!!

سلام اے میرِ کارواں سلام

☆☆☆☆☆

سیدہ آیت گیلانی

گڈ مارننگ

گھڑی کی سوئی صبح کے آٹھ کی طرف رواں تھی اور جیسے ہی اس نے گول نقطے کو جھولا موبائل کے آلارم نے چیخنا شروع کر دیا۔ گذشتہ رات بھی پچھلی راتوں کی سی بے ترتیب ہی تھی نیند ہمیشہ کی طرح روٹھی ہی رہی اور جیسے ہی رات کالی سے گوری ہوئی تو--- کے لیے پلکیں بوجھل ہونا شروع ہو جاتیں اور پھر آٹھ بج جاتے اور جاگنا پڑتا، موبائل پکڑا اور سوجھی آنکھوں کے ساتھ مسیجز دیکھنے شروع کیے، سارے کے سارے مختلف کمپنیوں کی پرموشنز کے تھے رات بھر جلتے سائیڈ لیمپ کو بند کیا، موبائل کو بیڈ پر پھینک کر واش روم کا رخ کیا کارپٹ پر مٹی کی موٹی تہہ جمی ہے۔ واش روم میں بیسن کے ساتھ لگے سٹینڈ میں تین برش پڑے ہیں سرخ کیپ والا برش پکڑا اس کو دھوتے ہوئے نظریں سٹینڈ میں پڑے ہوئے دو چھوٹے برشوں پر پڑی دونوں پر ہلکے ہلکے جالے گدگدی کر رہے ہیں اُف یہ بچے ذرا بھی خیال نہیں رکھتے۔ واش روم سے باہر نکلتے ہوئے کچن کی طرف جاتے ہوئے پیر روزانہ ہی ایک بے بی کار سے ٹکرا جاتا، آہا۔ ہائے خدا کی پناہ ایسے بے ترتیب کھلونے پھینکے ہوئے۔ تم لوگ روز ہی کوئی نہ کوئی میرے پیر کے نیچے آ جاتے ہے۔ کھلونوں پر مٹی اتنی گہری کالی ہے کہ ان کی اصلی ہیئت اور رنگ کہیں کھو گئے ہیں۔

گڈ مارننگ، پلیز گیٹ اَپ ایوری باڈی ٹی وی لاونج میں صرف ٹی وی ریموٹ واحد شے ہے جس پر مٹی کی تہہ نہیں ریموٹ کا بٹن دبانے پر سکرین پر خبریں گشت کرتی نظر آتی ہیں۔ کچن میں بھی البتہ کچھ چیزیں جو غالباً چھونے سے صاف رہ گئی ہیں۔ ڈوڈو، ڈوڈو میرے راجو دودھ پیو گے، اچھا میں لاتی ہوں۔ چائے میں پانی ڈالنے کی آواز آتی ہے، سینک کی سائیڈ پر ایک فیڈر پڑا ہے۔ جس پر بھالو اور بندر کی تصویر بنی ہے دونوں

نوین روما

جانوروں کے گرد پھپھوندی نے ایسی ڈوری بنائی ہے کہ گویا بھالو اور بندر پھنسے جا رہے ہیں۔ چولہے کے پاس دو کپ ہیں لیکن چائے کے برتن میں پانی ایک کپ کے مطابق ہے۔ لگتا ہے میں حسب عادت بیڈ روم کا پنکھا چلتا چھوڑ آئی ہوں۔ اوہو کبھی یاد نہیں رہتا۔ بیڈ روم میں آکر پنکھا بند کیا۔ بیڈ روم کی چادر صرف دائیں کونے سے تھوڑی سے بے ترتیب ہے بیڈ روم سے آگے ڈرائنگ روم باقی چادر اپنی جگہ پر ہے وہاں صوفے --- سے بڑے ہیں کسی صوفے پر ہلکی سی بھی سلوٹ نہیں ہے۔ کھڑکیاں کھول دوں، خزاں کی یہ ہوا میرے دل کو چھو جاتی ہے ذرا میرے گھر میں یہ بھر جائے۔ مانو اٹھو بیٹا، سورج سر پر آنے کو ہے اتنی دیر بھوکے نہیں سوتے کب سے سو رہی ہو پھر جب میں کچن میں جاؤں گی تو آواز دوں گی۔ ماما ایک گلاس ٹھنڈا ملک شیک اور ڈوڈو کی آواز آئے گی ماما دودو، اور تمہارے بابا کی آواز آئے گی ایک کپ گرم چائے ٹی بیگ والی۔ ہاہاہا سارے گھر میں قہقہے کی آواز گونجی اور دیواروں سے ٹکرا کر واپس آگئی۔ چولہے پر رکھی چائے کی کیتلی کے باہر پانی کے قطرے گول گول ہونے لگے پانی گرم ہونے والا ہے۔ ٹی وی کی آواز یکدم بند ہوگئی۔ اوہو یہ لائٹ بھی نا سویرے سے ہی جانے لگی۔ کچن تک جاتے ہوئے ملحقہ کمروں میں بچھے قالینوں پر صرف دو ہی پاؤں کے نقش آپس میں اُلجھ کر عجیب سے ڈیزائن کے لگ رہے تھے۔ اوہ_ لگتا ہے پانی گرم ہو گیا۔ مگ میں صرف ایک ٹی بیگ ہے۔ گھر کے سناٹے میں چینی کے دانے مگ میں گرنے کی آواز تیز گھنگھروں جیسی ہے۔ اتنے سارے سوالوں کا کوئی جواب نہیں آ رہا۔ پورے گھر میں صرف سوال ہیں اور ہو تم لوگ، مجھے کتنا ستاتے ہو سارا دن بولتی رہتی ہوں مجال ہے کوئی جو اب آئے ارے کچھ تو خیال کرو میرا، حد ہوتی ہے - جناب آپ سے پوچھ رہی ہوں، چائے بننے کو ہے اور آپ نے تو چینی بھی کم کر دی ہے اب ڈیڑھ چمچے سے ایک، ہاہاہا۔ ہلکے سے قہقہے کی آواز۔ چلو اچھا ہے۔ دودھ کا ڈبہ پکڑتے ہوئے اسکا ڈھکن کھلتا ہے۔ بس میں سارا دن کام کرتی ہوں ان لوگوں کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ چائے کی کیتلی ہلکا ہلکا سا ہل رہی ہے۔ جیسے اس میں زلزلہ آ رہا ہے اور بس اس کا ڈھکن اُڑنے کو ہے اس کا لرزنا تیز ہو گیا۔ ایک کپ گرم چائے --- بیڈ روم کی جانب سے ایک مترنم آواز آئی اور ساتھ ہی چائے کی کیتلی نے تیز سیٹی بجا کر گھر کا سکوت توڑ دیا۔

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے نلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورنٹل کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

۱۹۸۷ء کے الیکشن: الیکشن کا اعلان عبوری حکومت کی مجبوری تھی۔ بے نظیر کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر اسٹیبلشمنٹ کے کان کھڑے ہوئے۔ اس کو مکمل طور پر تو نہ روکا جا سکتا تھا لیکن راہ میں روڑے ضرور اٹکائے جا سکتے تھے۔ اس کے راستے کا سب سے بڑا اور بھاری پتھر نواز شریف ثابت ہوا۔ مرکز اور سندھ میں تو پیپلز پارٹی جیت گئی لیکن پنجاب میں مینڈیٹ منقسم ہو گیا۔ کافی تعداد میں آزاد اُمیدوار جتوائے گئے۔ ظاہر ہے ان سب کو میاں نواز شریف کے کیمپ میں آنا تھا۔ اس کے علاوہ صوبے کی انتظامیہ نے بھی ان کی بھرپور مدد کی۔ جو

لوگ آج چھانگا مانگا میں آپریشن کا طعنہ دیتے ہیں وہ دراصل کیا چاہتے تھے۔ یہی کہ وہ سب آزاد ممبر پی پی کی جھولی میں جا گرتے۔ دونوں پارٹیوں نے پنجاب میں حکومت بنانے کی کوشش کی لیکن کامیابی مسلم لیگ کو ہوئی۔ یہاں سے مخاصمت کا ایک نیا باب شروع ہوا۔

رحیم یار خان کی حد تک بھی کافی سیاسی ردو بدل ہوا۔ حاجی سیف اللہ جس نے آئین پاکستان کا ماہر ہونے کے حوالے سے بڑا نام کمایا تھا اور جو سابقہ حکومت میں وزیر بھی تھا، الیکشن ہار گیا۔ اس قدر زیرک، ہوشیار موقعہ پرست اور چالاک سیاست دان میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ حاجی صاحب کا مسئلہ یہ تھا کہ ان کا پالا ایک ایسے شخص سے پڑا تھا جو لیاقت پور کا روحانی پیشوا تھا۔ احمد عالم انور کو جن لوگوں نے نزدیک سے دیکھا ہے وہ حیران ہوتے ہیں کہ نسیان کا مارا ہوا یہ شخص الیکشن کیسے جیت جاتا ہے۔ ڈھیلا ڈھالا لباس، حد سے زیادہ باہر نکلتی ہوئی توند، مخصوص سفید رنگ کی پگڑی، بے ہنگم داڑھی اور کھوئی کھوئی سی نظریں، اُن کی یادداشت کا یہ عالم تھا کہ گاڑی سے نکل کر لوگوں سے ہاتھ ملاتے ملاتے اپنے ڈرائیور کو جپھا ڈال کر کہتے ”آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔“

وہ بے چارہ دست بستہ عرض کرتا ”مخدوم سائیں! میں تہاڈا ڈرائیور ہاں“

”ھلا، ھلا“ کہہ کر وہ آگے بڑھ جاتے اور پھر کچھ دیر بعد اسی عمل کو دہراتے۔ بجائے خفا ہونے کے لوگوں کو ان کی یہ ادائیں پسند تھیں۔ وہ اسے ان کی سادگی اور خلوص سے تعبیر کرتے۔ پنڈی جانے کے لئے احمد صاحب ملتان سے فلائیٹ پکڑتے۔ کبھی کبھی وہ وقت پر ایئرپورٹ نہ پہنچے۔ جہاز نکل جاتا تو کراچی والی فلائیٹ پر سوار ہو جاتے اور کراچی سے پنڈی والا جہاز پکڑ لیتے۔ عملاً رنگین مزاج تو نہ تھے لیکن کسی حد تک دل پھینک ضرور واقع ہوئے تھے۔ جہاز میں بیٹھ کر ایئر ہوسٹس کو بار بار بلاتے لیکن ہر دفعہ ہمشیرہ کہہ کر مخاطب ہوتے۔ ہمشیرہ ایک گلاس پانی لا دو۔ ہمشیرہ ایک کپ چائے پلا دو! سیٹ بیلٹ میرے پیٹ پر نہیں تک رہی۔ ذرا اسے کس دو! وغیرہ۔ فلسفے میں ایم اے کر رکھا تھا۔ لگتا تھا اُس کی چھاپ کچھ زیادہ لگ گئی ہے۔ اسمبلی میں ان کی حاجی صاحب سے ہمیشہ نوک جھونک رہتی۔ حاجی زندگی میں ایک مرتبہ ایم این اے بنے اور وہ بھی خانپور کی سیٹ سے۔ نان پارٹی الیکشن میں پتہ نہیں کس طرح ان کی لاٹری نکل آئی۔ ایک دفعہ غصے میں آ کر حاجی صاحب نے سپیکر سے مطالبہ کر دیا کہ احمد عالم انور کا دماغی معائنہ کروایا جائے۔ میرے دفتر میں میٹنگ تھی۔ سارے ممبران اسمبلی اکٹھے تھے۔ حاجی صاحب بھی بطور وزیر تشریف لائے۔ سب سے ہاتھ ملاتے ملاتے جب انہوں نے احمد عالم انور سے ہاتھ ملانا چاہا تو اس نے

صاف انکار کر دیا۔ اس پر بڑی بدمزگی ہوئی۔ میں نے سرزنش کی تو بولے "اس شخص نے بھری اسمبلی میں مجھے پاگل کہا ہے۔ اب یہ پاگل سے کیا توقع کر سکتا ہے؟"

مخدوم صاحب بڑے مہمان نواز تھے۔ دعوت کرنے کا بڑا شوق تھا لیکن دعوت دے کر اکثر بھول جاتے۔ جب مہمان ان کے ڈیرے ترنڈہ محمد پناہ پہنچتا تو بڑی سادگی سے پوچھتے "کیسے آنا ہوا؟" اس لئے جب بھی انہوں نے دعوت کی ہم احتیاطاً گھر سے کچھ نہ کچھ کھا کے چلے۔

حاجی سیف اللہ بڑی سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ عام حالات میں اس شخص کو ہرانا ممکن نہیں ہے اس لئے کیوں نہ اس کا ٹیکنیکل ناک آؤٹ کیا جائے۔ خوش قسمتی سے ایک ایسا سول جج ان کے ہاتھ آ گیا جو لیاقت پور میں ہر شام ان کے بھائی کے ساتھ شغل شب کیا کرتا تھا۔ عین پلاننگ کے مطابق ایک دن اس سول جج نے احمد عالم انور کو بلا کر کہا "مخدوم صاحب! آپ روز کوئی نہ کوئی سفارش کر دیتے ہیں جو میں اکثر بھول جاتا ہوں۔ آپ ایک مرتبہ ہی ان مقدمات کی فہرست مرتب کر کے مجھے دے دیں جن میں آپ Favour چاہتے ہیں۔ مخدوم صاحب نے خوش ہو کر اپنے دست مبارک سے بارہ مقدمات کی فہرست بنا کر اس کے حوالے کی۔ اگلی صبح اس نے انہیں توہین عدالت کا نوٹس دے دیا۔ ان کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے اور اس کے ساتھ ایک کاپی ہائی کورٹ کو بھجوا دی۔ اس نیک بخت نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ اگلے دن تھانے میں رپٹ لکھوا دی کہ صبح میں اپنے بچوں کو سکول چھوڑنے گیا تو احمد عالم انور چند غنڈوں کو لے کر آیا۔ مجھ پر فائرنگ کی اور ساتھ ہی نعرہ زن ہوا۔ بچنے نہ پائے۔

حاجی صاحب نے بزعم خود سکہ بند کام کیا تھا۔ ایک مجرم جیل میں سزا تو کاٹ سکتا ہے، الیکشن نہیں لڑ سکتا۔ نصف رات کا عمل تھا۔ میرے آپریٹر نے مجھے اطلاع دی کہ احمد عالم آیا ہے بڑا گھبرایا ہوا ہے اور کہتا ہے مجھے ڈی سی صاحب سے ہر حالت میں ملنا ہے۔ عام حالات میں ڈپٹی کمشنر اس سے کسی کو نہیں ملتے۔ ملک کرم داد تو دفتر ٹائم کے بعد ٹیلیفون کال بھی نہیں سنتا تھا لیکن میرا طریق مختلف تھا۔ میں نے بطور ڈپٹی کمشنر کبھی بھی اوقات ملاقات مقرر نہ کیے۔ سائل سارا دن مجھے مل سکتے تھے۔

میں نے کہا "انہیں کیمپ آفس میں بٹھاؤ۔ میں لباس تبدیل کر کے آتا ہوں۔" جب میں اسے ملا تو وہ پسینے میں شرابور تھا۔ اس نے تمام واقعہ بلاکم وکاست سنایا۔ میں نے تسلی دی کہ اس کے خلاف کوئی ایکشن نہیں ہوگا۔ ساتھ ہی فون کر کے ایس ایس پی کو ہدایت کی کہ پولیس نہ تو احمد عالم انور کے خلاف 307PPC کا پرچہ درج کرے گی اور نہ اسے سول جج کے حکم پر گرفتار کیا جائے گا۔

صبح ساری خبر حاجی صاحب تک پہنچ چکی تھی۔ وہ دوڑے دوڑے میرے پاس آئے اور شکایتاً فرمانے لگے ''ڈی سی صاحب آپ شکار میرے ہاتھ سے نکال رہے ہیں۔''

عرض کیا ''شکار تو جانوروں کا کیا جاتا ہے۔''

''تو آپ اسے انسان سمجھتے ہیں؟'' وہ غصے سے دھاڑے۔

''ہاں میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ آپ ایسی رسم نہ ڈالیں جو کل کلاں آپ کے خلاف ہی استعمال ہو۔''

وہ کافی دیر تک اصرار کرتے رہے اور آخر میں زچ ہو کر بولے ''بات یہ ہے کہ تم لوگ اس سے ڈرتے ہو۔''

''حاجی صاحب! آپ وزیر ہیں۔ حکومت کے نفس ناطقہ ہیں۔ میں آپ سے تو ڈرتا نہیں وہ ایک مجذوب سیّد ہے اس سے کیا ڈروں گا۔''

وہ بڑبڑاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ انھوں نے وزیر اعلیٰ سے شکایت بھی کی لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ میری ان سے بول چال بند ہو گئی۔ جب ضیاء الحق نے اسمبلیاں توڑیں تو حاجی صاحب کچھ دیر کے لئے لیاقت پور سے غائب ہو گئے۔ غالباً انہیں اندیشہ تھا کہ میں انتقامی کارروائی کروں گا۔ کچھ عرصہ بعد ان کا فون آ گیا ''سر! السلام علیکم۔ میں حاجی سیف اللہ بول رہا ہوں۔ سلام کے لئے آنا چاہتا ہوں'' مجھے ہنسی آ گئی۔

میں نے کہا ''حاجی صاحب آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ اگر میرے پاس آئے تو لوگ سمجھیں گے کہ حاجی ڈر گیا ہے۔ میں کل لیاقت پور دورے پر آ رہا ہوں۔ گھر آ کر آپ کے ساتھ چائے پیوں گا۔''

جب میں انہیں ملا تو خاصے متاثر نظر آئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولے ''ایسا بھی ہوتا ہے میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔''

احمد محمود، اکبر محمود اور مخدوم الطاف نے خیر ہونا ہی تھا لیکن میاں عبدالخالق اور جعفر اقبال گجر بھی پہلی بار بالترتیب ایم این اے اور ایم پی اے منتخب ہو گئے۔ ایوب مارتھ کے زمانے میں تو خالق کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، اس نے الیکشن کیا لڑنا تھا۔ جعفر نے جسارت کی اور بری طرح ہار گیا لیکن کسی نہ کسی طرح اس کے والد صاحب چوہدری محمد اقبال نے اس کی بیگم عشرت اشرف کو لیڈی سیٹ سے ایم این اے بنوا دیا۔ شروع میں عشرت بالکل گھریلو عورت تھی۔ ریحانہ علیم مشہدی سے دوستی نے اس کی خفیہ صلاحیتوں کو خوب بیدار کیا اور اس کا شمار بھی سیاست دانوں میں ہونے لگا۔ الیکشن سے پہلے جعفر اقبال میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ سر! ہم لوگوں نے سیاست سے کنارہ کشی کا فیصلہ کیا ہے! وجہ؟ میں نے پوچھا۔ بولا خاندان میں پے در پے اموات نے ہمیں نڈھال کر دیا ہے۔ گجر برادری کی تعداد بڑی قلیل ہے۔ پچھلے الیکشن میں سابقہ ڈپٹی کمشنر نے مجھے عمداً ہروا دیا تھا۔ کیونکہ میرے مقابلے میں ظفر اقبال جٹ تھا۔ میں نے اس کی ڈھارس بندھوائی اور اسے

سمجھایا کہ نوجوان آدمی کو ہمت نہیں ہارنی چاہئے۔ زندگی میں ایسے جانسوز مراحل آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ بولا "میاں نواز شریف دورے پر آ رہا ہے۔ میری اس سے ملاقات کرا دیں۔ نیز مجھے بھی ریسیپشن لائن میں کھڑا کریں تا کہ میں اسے پھولوں کا ہار پہنا سکوں۔"

الیکشن شیڈول کا اعلان ہوا تو دونوں میرے پاس آئے اور کہنے لگے "ہمیں آپ کی ضمانت چاہئے"۔

"کس بات کی؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ بولے "یہی کہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو دھوکہ نہیں دے گا۔ ہمیں ایک دوسرے پر مکمل اعتبار نہیں ہے۔" مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے تسلی دے کر انہیں گھر بھیج دیا۔ دونوں منتخب ہو گئے۔

الیکشن سے پہلے جونیجو اور میاں نواز شریف میں ٹھن گئی تھی۔ میاں صاحب نے مجھے فون کر کے کہا "انہوں نے مسلم لیگیوں کی میٹنگ بلائی ہے۔ عشرت کو کہیں کہ وہ بھی اٹینڈ کرے۔"

میں نے عشرت کو جب پیغام دیا تو بولی "یہ خود جا رہا ہے۔ میٹنگ بلا کر کیا کرے گا!" مجھے خوب پتہ تھا کہ اس کا جواب یہی ہوگا۔ جونیجو کے ان پر بڑے احسانات تھے۔ اس نے انہیں اسلام آباد میں ایک بہت بڑا پلاٹ دیا تھا۔ اس کے بھائی کو علاج کے لئے سرکاری خزانے سے زر کثیر دیا تھی اور اس کی وفات کے بعد پنڈی سے رحیم یار خان نعش کو لانے کے لئے C130 جہاز فراہم کیا تھا۔ میں نے ساری باتیں تو میاں صاحب کو نہ بتلائیں صرف اتنا کہا "وہ کہتی ہے سوچ کر جواب دوں گی۔"

جب میاں نواز شریف دوبارہ وزیر اعلیٰ بن گیا تو یہ لوگ شہد کی مکھیوں کی طرح اقتدار کے چھتے کے اردگرد بھنبھنانے لگے۔

بہاولپور میں میاں صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر پوچھا "وہ جعفر اقبال کو ایڈوائزر بنانے لگے ہیں مجھے کوئی اعتراض تو نہیں۔" اگر میں عشرت کے الفاظ ہی دہرا دیتا تو ایڈوائزری کا باب ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتا اور پھر شاید در توبہ بھی نہ کھلتا۔

میں نے کہا "جعفر نوجوان ہے۔ متمول گھرانے سے اس کا تعلق ہے۔ کوئی حرج نہیں۔" جعفر کو اور کیا چاہئے تھا۔ ایک جھنڈے والی کار اور اس کے آگے مسلسل ہوٹر بجانے والی پولیس اسکارٹ۔

رحیم یار خان کی اندرا گاندھی:

میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب ایک دن سیٹھ اسلم ایم پی اے نے مجھے بتایا کہ عشرت نے جعفر اور خالق کو مشورہ دیا ہے کہ ڈی سی کا تبادلہ کرا دو۔ وجہ.....؟ اس کا خیال ہے کہ اس ڈی سی نے ان کی Miseries دیکھی ہیں۔ ان کو ہر وقت گڑگڑاتے دیکھا ہے۔ یہ اس کے سامنے ہمیشہ دبے رہیں گے اور کھل کر بات نہیں کر سکیں گے۔ نیا ڈی سی آئے گا

تو وہ انہیں سر! سر! کہے گا۔ مجھے جعفر ملا تو میں نے اسے کہا" مجھے علم نہیں تھا کہ تمہاری بیوی پاکستان کی اندرا گاندھی ہے۔ اس قدر زیرک لوگ ملک میں روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ایک دن بہت ترقی کرے گی۔ مجھ سے لکھوالو!"

لیاقت پور سے اصغر کریرہ منتخب ہوا۔ اس سے پہلے بھی وہ ایم پی اے رہ چکا تھا۔ نہایت بذلہ سنج، حاضر جواب اور مخلص شخص تھا۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ میاں نواز شریف کیسے ہی سنجیدہ موڈ میں کیوں نہ ہوتا یہ انہیں ہنسا دیتا۔ جمال دین والی اور بھونگ کے حلقے سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر رئیس شبیر ایم این اے بنا۔ یہ رئیس غازی کا بڑا بیٹا تھا۔ کسی زمانے میں پی پی گورنمنٹ میں وزیر مال بھی رہ چکا تھا۔ دراصل خوشامد کے فن کو یہ نئی بلندیوں تک لے گیا تھا۔ چرب زبان، موقع پرست، مردم شناس بھٹو جیسے گھاگ سیاست دان کو بھی اس نے شیشے میں اتار لیا تھا۔ اس کی حکومت کا تختہ الٹتے ہی آنکھیں پھیر لیں۔ ہر وقت تسبیح ہاتھ میں رکھتا تھا۔ سال کا نصف حصہ مدینہ منورہ میں گزارتا۔ وہاں اس نے مکان خرید رکھا تھا۔ وہاں جا کر اس کے دو ہی مشاغل ہوتے، عبادت تو یقیناً کرتا ہوگا۔ دوسرے کام کو بھی یہ عملاً عبادت سمجھ کر ہی نبٹاتا۔ ملک کے جتنے بااثر لوگ ہیں سب کو طویل خط لکھتا۔ ہر خط اس جملے سے شروع ہوتا۔ روضہ رسول پر بیٹھا ہوں، یہ سطور لکھتے وقت بھی آپ کے لئے دعا مانگ رہا ہوں۔ خط پڑھ کر ایک مرتبہ تو گنہگار سے گنہگار انسان بھی ہل جاتا۔ اس کے مخالفین کا خیال تھا کہ بیشتر خطوط منوڑے میں بیٹھ کر لکھتا ہے۔

رئیس شبیر مجھے گھر ملنے آیا تو آتے ہی میرے گھٹنے پکڑ لئے۔ کہنے لگا" ہم لوگ پیر پرست ہیں۔ سادات کے غلام ہیں۔ مجھے اُمید ہے آپ مایوس نہیں لوٹائیں گے۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی کہ رحیم یار خان کا سب سے بڑا زمیندار مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ پوچھنے پر کہنے لگا" میں نواز شریف سے اس کی ملاقات کرا دوں اور اسے مسلم لیگ کا ٹکٹ لے کر دوں۔"

میں نے کہا" آپ تو پیپلز پارٹی میں ہیں۔ کیا کوئی اختلاف ہو گیا ہے۔"

بولا" اس پارٹی کا کیا فائدہ جو مجھے الیکشن نہیں جتوا سکتی۔ میں احمد محمود کی مدد کے بغیر الیکشن نہیں جیت سکتا اور احمد مسلم لیگ میں ہے۔

ضلع میں پیپلز پارٹی صرف ایک سیٹ لے سکی۔ میانوالی قریشیاں سے مخدوم رکن الدین اپنے بھتیجے مخدوم شہاب الدین کو ہرا کر الیکشن جیت گیا تھا۔ قریشی خاندان بھی اپنے علاقے کی حد تک بڑا با اثر تھا۔ اس سے پہلے شہاب کے والد مخدوم حمید الدین الیکشن جیتتے رہے۔ وہ بڑے رکھ رکھاؤ والے انسان تھے۔ اصول پرستی کا یہ عالم تھا کہ بغیر سلیپنگ گاؤن پہنے سو نہیں سکتے تھے۔ اخبار پڑھنے سے پہلے شیو ضرور بناتے۔ آٹھ بجے ناشتہ

کرتے۔ اگر چند منٹ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو ہاتھ کھینچ لیتے اور ڈائننگ ٹیبل سے اُٹھ جاتے۔ کسی سے ہاتھ ملاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ بہ امر مجبوری ایسا کرنا پڑتا تو فوراً غسل خانے میں جا کر صابن سے ہاتھ دھوتے اور احتیاطاً دو چار کلیاں بھی کر لیتے۔ دروازہ بھی چھڑی سے کھولتے۔ ضلعی ہیڈ کوارٹر میں اول تو آتے نہیں تھے کبھی کبھار آنا بھی ہوتا تو ان کے ملیجر دس دن پہلے ڈی سی سے ملاقات کی تفصیلات طے کرتے۔ وہ بھی کچھ عرصہ بھٹو کے دور میں وزیر رہے۔ مخدوم الطاف ان کا داماد تھا۔

مسائل پسند مولوی اور خطر پسند انتظامیہ: ایک دن دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ قاری حماد اللہ شفیق کا فون آیا وہ رؤف ربانی اور حافظ اکبر کے ساتھ آ کر گھر میں پرائیویٹ ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا، یہ تینوں حضرات جب یکجا یا یک زبان ہو جاتے تو شہر کے در و دیوار ہلنے لگتے۔ It was the most lethal Combination پلاننگ، سازش اور ہشیاری ان پر ختم تھی۔ دیکھنے میں تو یہ دقیانوسی خیالات کے نیم خواندہ مولوی لگتے لیکن جو تجربہ انھوں نے محراب و منبر سے حاصل کیا تھا وہ تعلیم پر حاوی تھا۔ ان کی بیدار مغزی کا یہ عالم تھا سپیشل برانچ اور دیگر انٹیلی جنس ایجنسیوں کے اہلکار ان کی 'پے لسٹ' پر تھے۔ اس ملاقات سے قبل ایک دن رؤف ربانی میرے پاس آیا اور رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا "مولانا حق نواز جھنگوی ایک دیگ میں چھپ کر کوٹ سمابہ میں جلسہ کرنے والا ہے۔ آپ اسے گرفتار کر لیں"

"لیکن وہ تو تمہارے مسلک کا مولوی ہے۔" مجھے حیرانی ہوئی۔

کہنے لگا "یہ درست ہے لیکن سیاست بھی کوئی چیز ہے۔ پھر انتظامیہ سے بھی بنا کر رکھنی پڑتی ہے۔" وہ شاید مولانا جھنگوی کا اتنا مخالف نہ تھا جتنا انتظامیہ کو Embarras کرنا چاہتا تھا۔ جو شرارت اس کے وجود میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی وہ بلی آنکھوں سے بھی صاف جھلکتی ہوئی نظر آتی۔ والد کی علالت کی وجہ سے واپس آ تو گیا تھا اور داڑھی بھی رکھ لی تھی لیکن عادتیں کہاں بدلتی ہیں۔ یہ تو مرنے کے بعد انسان کی قبر کا طواف کرتی ہیں۔ مسجدوں اور مدرسوں کی شکل میں انہوں نے درحقیقت بزنس ہاؤس کھڑے کر رکھے تھے۔ اتنی منفعت کسی فیکٹری میں نہیں ہوتی جتنا منافع بخش مدرسوں کا کاروبار ہو گیا ہے۔ ضیاء الحق نے ان کو منظم کرنے کے لئے سالانہ بھاری گرانٹس مقرر کر رکھی تھیں اور اس کے لئے فی طالب علم وظیفہ مختص تھا۔ انہوں نے جعلی رجسٹر بنا رکھے تھے۔ سو طالب علموں والا مدرسہ بھی پانچ سو طالب علم ظاہر کرتا۔ محکمہ اوقاف اور مقامی انتظامیہ کی جرأت نہ تھی کہ ان کی فراہم کردہ فہرستوں کو غلط قرار دیتے۔

کوئی بھی جمعے کے وعظ کی ضرب نہ سہہ سکتا تھا۔ جس کسی سے ناراض ہوتے تو منبر رسول سے مغلظات، الزامات اور اتہام کی بوچھاڑ کر دیتے۔ بچوں کو نکال کر سڑکوں پر نعرہ زنی کراتے اور دفتروں کا گھیراؤ کرا دیتے۔ وطن عزیز میں لوگ پولیس سے ڈرتے ہیں۔ پولیس ان سے خائف رہتی اور وقتاً فوقتاً ان کی خاطر مدارات کرتی رہتی۔

میں نے باورچی کو کہا کہ مولوی صاحبان آرہے ہیں۔ حلوے کے علاوہ بھی جو کچھ بنا سکتے ہو بنا ڈالو کیونکہ خوراک کے معاملے میں یہ معاف نہیں کرتے۔ باورچی دائم بھی ان کا مزاج آشنا تھا۔ چنانچہ اس نے مرغ روسٹ، پکوڑے، شامی کباب اور حلوہ پوری کا بندوبست کر دیا۔

وہ عین وقت پہنچے اور کافی دیر تک آزمائش کام و دہن ہوتی رہی۔ اچھے موڈ میں لگتے تھے اس لئے کھانے کے ساتھ ساتھ ہلکا پھلکا مزاح بھی چلتا رہا۔ جب سورج غروب ہونے لگا تو میں نے استفسار کی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ قاری حماد اللہ اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا ''ہم جس کام کے لئے آئے ہیں وہ کام کے علاوہ آپ کی انتظامی صلاحیتوں کا امتحان بھی ہے۔'' یہ سن کر مجھے قلق تو ہوا لیکن اپنے جذبات چھپاتے ہوئے کہا ''فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' اس پر تینوں بیک وقت بول اُٹھے ''ہمیں سیٹلائٹ ٹاؤن والی مسجد آج ہی واگزار کرانی ہے۔ آپ نے دفعہ ۱۴۴ ض ف کے تحت اندیشہ نقص امن کی آڑ لے کر اس کو سیل کر رکھا ہے۔ گو ہمارا مخالف فریق ڈاکٹر طارق بھی دیوبندی ہے لیکن مسجد ہماری ہے۔''

میں نے انہیں بڑا سمجھایا کہ قانونی تقاضے پورے کیے بغیر مسجد واگزار نہیں ہو سکتی لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہے۔ جب بحث طوالت اختیار کر گئی تو قاری حماد اللہ زچ ہو کر مجھے دھمکی دیتے ہوئے بولا ''پھر دیکھ لیں۔ محرم قریب آرہا ہے۔ ہم آپ سے تعاون نہیں کریں گے۔''

''قاری میرا نام جانتے ہو؟'' میں اپنا غصہ ضبط نہ کر سکا۔

''میرا نام شوکت علی شاہ ہے، مائیکل جانسن نہیں۔ میں بھی اسی ضلع کا رہنے والا ہوں جہاں سے تمہارے ساتھی ہجرت کر کے آئے ہیں۔ جو لوگ قانون ہاتھ میں لیتے ہیں ان سے نبٹنا مجھے خوب آتا ہے۔'' تینوں غصے سے پیر پٹخ کر بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

اگلے دن جب میں نے مقامی اخبار دیکھے تو سب کے صفحہ اوّل پر جلی حروف میں ایک قسم کی خبر لگی ہوئی تھی۔ ''محرم کے روٹ بدلے جا رہے ہیں'' محرم کے روٹ متعین ہوتے ہیں اور ان کو عام حالات میں بدلنا نہ تو ممکن ہوتا ہے اور نہ قرین مصلحت۔ ماتمی جلوس مقررہ وقت میں متعین راستوں پر چلتے

ہیں۔ جہاں پر مختلف مسالک کی مساجد بھی آتی ہیں اور یہی "فلیش پوائنٹس" ہوتے ہیں۔ خاص طور پر اذان کے وقت صورت حال خاصی نازک ہوتی ہے۔ اب یہ کہہ کر لوگوں کو اشتعال دلانا کہ انتظامیہ یک طرفہ طور پر من مانی کرنا چاہتی ہے، خاصا خطرناک عمل تھا۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ جمعہ کے وعظ میں کچھ ایسا تاثر دیا جیسے واقعی روٹ بدل گئے ہیں۔ پھر انہوں نے ضلع میں جگہ جگہ جلسے جلوس کر کے بغیر کسی جواز کے فرقہ واریت پھیلانی شروع کر دی۔ میں نے ایس ایس پی کو بلایا اور اسے کہا کہ وقت آ گیا ہے کہ ان لوگوں سے سختی سے نپٹا جائے۔ سحری ایک تجربہ کار افسر تھا۔ بولا شاہ صاحب! ان کی گرفتاری سے ضلع میں فرقہ واریت کی آگ بھڑک اُٹھے گی۔ تمام ممبران اسمبلی، تاجر اور متمول لوگ ان کی مٹھی میں ہیں۔ دراصل ہر ایک ان سے خائف ہے۔ بات وزیر اعلیٰ تک پہنچے گی اور یہ لوگ ہمارا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ کیا آپ اس عمل کو مؤخر نہیں کر سکتے؟ میں نے اسے سمجھایا کہ جس تسلسل اور تواتر سے لوگوں کو ورغلا رہے ہیں اس سے صورت حال زیادہ بگڑ سکتی ہے۔ اگر سلگتی ہوئی چنگاریاں بروقت نہ بجھا دی جائیں تو پھر سمندر بھی سرکش شعلوں کو سرد نہیں کر سکتے۔ ہم ایک روڈ میپ تیار کرتے ہیں جس میں سب سے اہم بات لوگوں کا خوف دور کرنا ہے۔"

سحری بادلِ نخواستہ تیار ہو گیا۔ میں نے سب سے پہلے ممبران اسمبلی، تاجروں، کارخانہ داروں اور دیگر مسالک کے علماء کو اعتماد میں لیا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ اگر آج ان کی زبان بند نہ کی گئی تو کل ان کے ہاتھ آپ سب کے گریبان تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ سب نے دبی دبی زبان میں اتفاق کیا۔ میں نے ان کے فرداً فرداً بیانات پہلے سے لکھ رکھے تھے۔ جن میں انہوں نے انتظامیہ کے عمل کو بروقت اور راست اقدام قرار دیا تھا۔ ہر قسم کی پیش بندی کے بعد ایک شام ہم نے ان تینوں کو 3MPO کے تحت گرفتار کر لیا۔ تبرکاً مجید زیدی صاحب بھی دھر لئے گئے۔ اب وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ ایک مخصوص فرقے کے مولویوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے لیکن اصل حیرانی انہیں اس وقت ہوئی جب شہر میں سے کوئی ایک آواز بھی ان کی حمایت میں نہ اُٹھی۔ اُلٹا ان کے خلاف پے در پے بیانات آنا شروع ہو گئے۔ پریس نے بھی کھل کر انتظامیہ کا ساتھ دیا۔ ایجنسیوں کے جو اہلکار ان سے منسلک تھے اور ساتھ دیتے تھے، انہیں بھی فوراً تبدیل کروا دیا۔ انہوں نے مدرسوں کے طالب علموں کے ذریعے جلوس نکالنے کی کوشش کی اور کسی حد تک وال چاکنگ بھی کی لیکن کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی۔

[جاری ہے۔]

باتیں قراۃ العین حیدر کی

شریکِ گفتگو: حامد یزدانی

یہ ۱۹۹۱ کے موسمِ بہار کی ایک دل کش سہ پہر کا ذکر ہے۔ جب وائس آف جرمنی کے شعبۂ اردو کے جرمن سربراہ ڈاکٹر گوئبل گروس کے ساتھ میں اور میری بیگم طاہرہ شہر کے مرکزی حصہ سے کچھ دور واقع اس ہوٹل پہنچے تھے جس میں اردو کی نام ور ادیبہ قراۃ العین حیدر یعنی عینی آپا ٹھہری ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے لابی ہی میں کافی پینے کو ترجیح دی اور میں طاہرہ کے ساتھ عینی آپا کے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

دستک کے جواب میں انھوں نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھولا۔

قراۃ العین حیدر: ارے، آپ آ گئے---

(یہ کہہ کر ہمیں اندر آنے کا راستہ دیا)

حامد یزدانی: یہ میری بیگم ہیں، طاہرہ۔

(میں نے بیگم کا تعارف کروایا)

قراۃ العین حیدر: طاہرہ؟--- بھئی یہ تو میرا فیورٹ نام ہے--- کیونکہ یہ میری پسندیدہ شاعرہ کا نام ہے: قراۃ العین طاہرہ۔ کمال کی شاعرہ ہے وہ--- آج کا دن بھی بہت مصروف رہا۔ پہلے چائے پی لیتے ہیں پھر باتیں کریں گے۔ کیا خیال ہے؟

حامد یزدانی: جی ضرور۔

طاہرہ یزدانی: آپ لوگ باتیں کریں میں چائے بنا دیتی ہوں۔

قراۃ العین حیدر: شکریہ طاہرہ۔ (پھر میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے) چلیے شروع کیجیے سلسلہ۔

حامد یزدانی: عینی آپا، یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ ثقافتوں کے عالمی ادارے کے تحت منعقدہ بین الاقوامی سیمینار کے لیے جرمنی کے شہر برلن تشریف لائیں اور یوں ہمیں بھی آپ سے ہم کلام ہونے کا موقع

مل گیا۔ سب سے پہلے یہ فرمائیے کہ ادھر مغرب میں مشرقی ادب کی نمائندگی کرتے ہوئے آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟

قرۃ العین حیدر: بھئی، ایسے ادبی اجتماعات تو اکثر ہوتے رہتے ہیں مشرق میں بھی اور مغرب میں بھی اور ان سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ مل بیٹھتے ہیں، بات چیت کر لیتے ہیں اور اُس سے آگے، میرے خیال میں، کچھ بات نہیں۔۔ کیونکہ جو اصلی چیز ہے کہ ان اجتماعات کے نتیجے میں عالمی برادری بننی چاہیے وہ نہیں بنتی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مابین کئی طرح کے barriers، کئی طرح کی رکاوٹیں حائل ہیں جن میں سیاسی حد بندیاں بہت نمایاں ہیں اور مغرب کا جو مشرق پر تسلط رہا ہے اس کی وجہ سے جو اجتماعی رویے ہیں مغرب کے وہ بہت حد تک حائل ہوتے ہیں اُس میں ایک تو میڈیا کا کردار ہے۔ مثلاً کل ہی ہم لوگ اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ برصغیر کے ادیبوں کی کتابیں یعنی مشرقی ادیبوں کی اور خاص کر اردو ادیبوں کی کتابیں مغرب میں نہیں شائع ہوتیں؟ کیوں شائع نہیں ہوتیں؟ اب اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ہاں، سوشلسٹ ممالک میں اردو کتابیں چھپتی تھیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں چھپتی تھیں اور اس کے پیچھے بھی سیاسی کارفرمائی کا عمل دخل رہا۔ اب اس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔۔۔ تو ادب اس وقت بہت سی پالیسیوں اور بہت سے نظریات کا شکار ہے۔۔۔ یا جو بھی کہہ لیں۔۔۔ ایسے اجتماعات کا انعقاد بہر حال اچھی بات ہے لوگ مل بیٹھیں، باہم بات چیت کریں مگر میں پھر کہوں گی کہ جو cultural barrier یا رکاوٹ ہے، جو ذہنی تحفظات ہیں لوگوں کے اور جو حد بندیاں ہیں ان کی وجہ سے کمیونی کیشن نہیں ہو پاتا ایسٹ اور ویسٹ کے درمیان اور اگر ہوتا بھی ہے تو بہت کم۔

حامد یزدانی: آپ مشرق اور مغرب کے تعلقات پر بات کر رہی ہیں اور وہ بھی جرمن سرزمین پر تو میں یہ بھی پوچھتا چلوں کہ خاص کر جرمنی کے وہ کون سے ادیب تھے جو آپ کو زیادہ پسند رہے ہیں؟

قرۃ العین حیدر: دیکھئے، جرمنی کے ادیبوں کی بات تو یہ ہے کہ جرمنی سے ہمارا جو ذہنی رشتہ رہا ہے وہ بہت پرانا ہے اور وہ رشتہ شروع ہوتا ہے پچھلی صدی کے آخر سے اور دل چسپ بات یہ ہے کہ تب تک شاید بہت سے لوگوں نے جرمن ادب اور ادیبوں کو پڑھا بھی نہ ہو لیکن جرمن موسیقی، جرمن آرٹ اور جرمن فلسفہ اور دوسری چیزوں کا تذکرہ لوگ ضرور سنتے رہیں رہے تھے۔ اچھا، اس کے بعد علامہ اقبال وسیلہ بنتے ہیں۔ علامہ اقبال، جیسا کہ

سب کو معلوم ہے، جرمن فلسفے اور فلسفیوں سے خاص دل چسپی رکھتے تھے۔ اچھا، پھر یہ کہ ٹامس من اور دوسرے کلاسیکی ادیبوں سے ہم متعارف ہوئے۔ ان کے بعد جو ماڈرن رائٹرز ہیں یا جرمنی کے ماڈرن لٹریچر کے تذکرے جو ہوئے ہیں ان میں سب سے مشہور تو کرسٹوفر اشروڈ کا ناول ہے 'گڈ بائے ٹو برلن'۔۔۔ تو ان سب سے جرمنی اور جرمن ادب کے متعلق ہمارے ہاں ایک romance بنا ہوا تھا اور پھر بیچ میں کیا ہوا کہ جنگ آ گئی تو پورے معاملات ہی بدل گئے۔ ہم برطانیہ کی کالونی یا نوآبادی تھے تو ہمارے رویے بھی مختلف بن گئے یا بنا دیئے گئے۔ شاید آپ کو یہ جان کر حیرت ہو کہ اُس دور میں ہندوستان میں جو قوم پرست یا انقلابی طبقہ تھا اس میں چٹوپادھیائے اور مولانا برکت اللہ اور بہت سے انقلابی شامل تھے تو وہ چونکہ برطانیہ کے خلاف تھے وہ سب آتے تھے جرمنی اور وہ یہاں بیٹھ کر اپنی منصوبہ بندی وغیرہ کرتے تھے۔۔ جیسے برابر ہوا ہے کہ ماسکو سے لوگ بھاگ کر آئے اور پیرس میں جمع ہو گئے۔ ہندوستان سے بھاگ کر آئے تو جرمنی میں، برلن میں بیٹھ گئے۔ اور جو نئے یا نوجوان قوم پرست تھے جیسے عابد حسین، ڈاکر حسین اور ڈاکٹر حمید۔۔ اور بھی بہت سے تھے جو کہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ برطانیہ کی یونی ورسٹیوں میں پڑھیں وہ بھی جرمنی آتے تھے۔ ظاہر ہے برطانیہ سے مخالفت کے سبب یہ نوجوان جرمنی کو اچھا سمجھتے تھے اور اسے ایک آزاد ملک تصور کرتے تھے کیونکہ وہاں وہ کسی دباؤ یا تسلط کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی مرضی سے جاتے تھے۔۔

حامد یزدانی: جرمنی اور جرمن ادب سے آپ کی ذاتی دل چسپی کا آغاز کب ہوا؟

قراۃ العین حیدر: بھئی، مجھے جرمنی سے شروع ہی سے، بچپن ہی سے اس لیے fascination رہا کہ گرِم برادرز (Jacob Grimm and Wilhelm Grimm) کی جو Fairy Tales تھیں وہ مجھے بے حد پسند تھیں۔ بھئی، جرمنی کا ایک جو رومانس ہے وہ پریوں کی کہانیوں کا ہے، old castles کا، پرانے محلات کا ہے، medieval romance یعنی قرونِ وسطیٰ کے رومانوی تصور کا ہے۔۔۔ میوزک ہے اور پھر فاوسٹ، گوئٹے۔۔ بہت سی اہم تصانیف، شخصیات اور چیزیں ہیں جن سے جرمنی کا تصور بنتا ہے اور یہ تصور، یہ امیج میرے لیے ہمیشہ دل چسپی کا باعث رہا۔

حامد یزدانی: آپ کی اس دل چسپی کا ثبوت تو ہمیں 'کارِ جہاں دراز ہے' کے افسانوں میں بھی ملتا ہے جن کے مناظر میں

جابجا یورپ اور خاص کر جرمن ماحول کی خوشبو بکھری ہوئی ہے۔

قراۃ العین حیدر: ہاں، یہ بات دیکھیں گے آپ میرے ہاں۔ اچھا، یہ بتایئے آپ کب سے ہیں یہاں، جرمن ماحول میں؟

حامد یزدانی: مجھے تو کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا یہاں۔ ۱۹۹۸ میں پہلی بار آنا ہوا تھا۔۔

قراۃ العین حیدر: میں نے سنا ہے کہ بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے پاکستان سے آئے سیاسی اور مذہبی پناہ گزینوں کو۔ سفر کی صعوبتیں اور پھر مختلف ماحول۔۔

حامد یزدانی: جی، یقیناً مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے انھیں۔ تاہم میرا ایسا کوئی ذاتی تجربہ نہیں۔ میں پہلی بار تعلیمی اور تفریحی سلسلہ میں آیا تھا اور اب گذشتہ برس سے ریڈیو دو بچے ویلے، دی وائس آف جرمنی کی اردو نشریات سے منسلک ہوکر لاہور سے کولون آیا ہوں۔

قراۃ العین حیدر: اچھا تو لاہور سے ہیں۔۔۔ تعلیم وغیرہ بھی وہیں ہوئی ہوگی۔۔!

حامد یزدانی: جی بالکل۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کیا تھا اور پھر ایم اے سوشیالوجی پنجاب یونی ورسٹی سے۔۔

قراۃ العین حیدر: ارے واہ۔ سوشیالوجی کا سبجیکٹ تو مجھے بے حد پسند ہے۔۔ اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور۔۔! بھئی، اس کالج کا تو بڑا نام ہے۔ کیسی کیسی شخصیات اس سے وابستہ رہیں۔۔ ہمارے دوست ادیب ڈاکٹر سلیم اختر بھی تو وہیں ہیں۔ جانتے ہیں آپ انھیں؟

حامد یزدانی: ایف اے میں میرے اردو کے پروفیسر وہی تھے۔

قراۃ العین حیدر: بہت خوب۔ ہمارے اچھے دوست ہیں۔ بہت اچھے ادیب اور نقاد ہیں۔ ان کی کتابیں انڈیا میں بھی دستیاب ہیں۔

حامد یزدانی: کتابیں تو آپ کی بھی لگ بھگ سبھی پاکستان میں شائع ہوچکی ہیں اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

قراۃ العین حیدر: افسوس، سب بلااجازت شائع کی گئی ہیں۔ سب pirate editions ہیں۔

حامد یزدانی: اب اشاعتی حقوق کے حوالے سے دوطرفہ قانونی معاملات تو پاکستان اور بھارت کی حکومتوں کو طے کرنا ہوں گے۔ مجھ سے قاری تو پڑھنے سے مطلب رکھتے ہیں۔ کیا کریں!

قراۃ العین حیدر: ہاں، دونوں طرف سے کچھ سرکاری پیش رفت ہونا چاہیے۔ مجھے لگتا ہے ادب لکھنے پڑھنے میں دل چسپی ہے آپ کو بھی۔

حامد یزدانی: جی، کچھ نہ کچھ لکھتا پڑھتا رہتا ہوں۔ ابھی بانو قدسیہ کا ناول 'راجہ گدھ'

پڑھتے ہوئے ایک مقام پر مجھے بے اختیار 'آخرِ شب کے ہمسفر' کے سندربن کی یاد آتی رہی کیسی متاثر کن منظر کشی کی تھی آپ نے! کہ جس سے بعد میں بھی استفادہ کیا گیا۔

قراۃ العین حیدر: بانو قدسیہ اردو کی بہت اہم لکھنے والی ہیں اور میں ان کی قدر کرتی ہوں۔

حامد یزدانی: یاد آیا ابھی پچھلے دنوں فیض احمد فیض صاحب کا ایک پرانا انٹرویو پڑھ رہا تھا جس میں انھوں نے ترقی پسند تحریک کی جانب سے علامہ اقبال اور آپ کے خلاف اختیار کیے جانے والے موقف کو تحریک سے اپنے اختلاف کی وجہ قرار دیا تھا۔ کچھ اس کا پس منظر بتائیں گی آپ؟

قراۃ العین حیدر: یہ تو بھئی اب آپ نے مجھے بتایا ہے۔ مجھے اس بات کا علم نہ تھا۔ اگر فیض صاحب نے علامہ اقبال کے ساتھ بریکٹ کر کے میرا ذکر کیا ہے تو یہ تو اعزاز کی بات ہے میرے لیے۔ مگر اب کیا پس منظر بتاؤں اس معاملے کا! اس پرانی بحث ہو چکی ہے کہ بس ہی کریں۔ دراصل اُس زمانے میں یہ لوگ بے sectarian تھے، فرقہ واریت کا شکار تھے۔ ان میں بے پناہ intolerance تھی، عدم برداشت تھی۔ وہ جوش کا زمانہ دو تین سال رہا پھر سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے۔ کون پرواہ کرتا ہے اب ان سب کی۔ وہ زمانہ ہی بدل گیا سب کا سب۔ سوشلزم جہاں سے یہ سب معاملات شروع ہوئے تھے ترقی پسندی کے وہاں کی حالت ہی پلٹ گئی تو اب باقی کیا رہا۔ ویسے بھی ایسی باتوں سے فرق کیا پڑتا ہے؟ دیکھیے، ایسے جتنے بھی ہنگامے اٹھتے رہتے ہیں یہ بس چائے کی پیالی کے طوفان ہوتے ہیں ان سے کیا فرق پڑتا ہے! انسان نے جو کچھ لکھا ہے وہ اگر زندہ رہتا ہے تو اصل چیز وہ ہے۔ اگر میں نے کوئی چیز ڈھنگ کی لکھی ہے تو وہ لوگوں کو یاد رہ جائے گی آج سے پچاس سال بعد بھی۔ وہی چیز ہے کام کی اور کچھ نہیں۔

حامد یزدانی: کیا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ادبی تحریکوں سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا یا نہیں پہنچا ادب کو؟ حال آں کہ ترقی پسند تحریک کے بارے میں تو کہا جاتا ہے کہ یہ اردو ادب کی اہم ترین تحریک تھی۔

قراۃ العین حیدر: نہیں، نہیں، میرا یہ مطلب نہ تھا--- بھئی، فائدہ ہے۔ ترقی پسند تحریک اہم ترین تحریک اس لحاظ سے تھی کہ اُس نے theme، موضوع اور content سب چیزوں میں بڑا انقلاب متعارف کروا دیا جس کے نتیجے میں بڑا جاندار ادب تخلیق ہوا۔ ہاں یہ بات بھی ماننا پڑے گی کہ اُس کے ساتھ کچھ انتہا پسندی بھی تھی۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ ادبی

تحریکیں بے فائدہ ہیں میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ اگر کسی نے کسی کے خلاف کچھ کہہ دیا تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اب اگر انہوں نے پہلے میرے خلاف بہت کچھ کہہ دیا اور سب اپنے موقف سے پلٹ بھی گئے تو ان باتوں کی اہمیت کیا ہے! ہاں، علامہ اقبال کی بات دوسری تھی۔ اس کے بارے میں جو کچھ کہا، کچھ روز بعد ان میں سے کچھ کو محسوس ہوا کہ یہ تو غلط بات ہوگئی تو انہوں نے نہ صرف رائے بدل لی بلکہ جو لوگ مذہب کی جانب جھکاؤ کی وجہ سے اقبال کے خلاف تھے وہی بعد میں خود بڑے مذہبی بن گئے تو کیا فرق پڑتا ہے اس سب سے! How does this matter? یہ سب تو چلتا رہتا ہے۔

حامد یزدانی: چلیے، بات کا رُخ کچھ بدل لیتے ہیں۔ 'آخرِ شب کے ہمسفر' کے سرورق پر پہلی بار میں نے آپ کے فن کا ایک نمونہ دیکھا تھا۔ اب میرے سامنے ہے ''گروشِ رنگِ چمن'' تو اس کا ٹائٹل بھی آپ کی فن کاری کی داد دے رہا ہے۔ یہ تصویر کاری کا شوق کب سے آپ کے ساتھ ہے؟

قراۃ العین حیدر: اور اب 'چاندنی بیگم' کا cover بھی میں ہی بنایا ہے۔ وہ کتاب شاید آپ نے دیکھی نہیں ابھی۔

حامد یزدانی: جی، ابھی دیکھی نہیں وہ کتاب میں نے۔

قراۃ العین حیدر: دیکھئے، وہ پڑی ہے اُس طرف۔ ابھی دیکھ لیجیے۔

حامد یزدانی: جی ضرور --- بہت عمدہ اور بامعنی ہے یہ سرورق بھی۔

قراۃ العین حیدر: ہاں، تو تصویریں بناتے ہیں کچھ شوق ہے اور بس۔

حامد یزدانی: میرا سوال یہ تھا کہ کب سے ہے یہ شوق؟

قراۃ العین حیدر: ہمیشہ سے۔ بچپن سے۔ جیسے بچے تصویریں بنایا کرتے ہیں ویسے ہی بنایا کرتی تھی۔ اور پھر بڑے بڑے فن کاروں کے فن پارے اور نمائشیں دیکھنے کے مواقع بھی ملے۔

حامد یزدانی: اس فن کی باقاعدہ تربیت کہیں سے حاصل نہیں کی؟

قراۃ العین حیدر: نہیں، زیادہ نہیں۔ ہاں، کچھ ماہ کے لیے لکھنؤ سکول آف آرٹ جائن کیا تھا میں نے اور پھر لندن میں کچھ دنوں کے لیے ایک کورس میں شرکت کی تھی۔ بس شوق ہے۔ جی چاہا تو کچھ بنا لیا نہیں بنایا تو مہینوں، برسوں کچھ نہیں بنایا۔

حامد یزدانی: ایک سوال خاص طور سے آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ ---

قراۃ العین حیدر: --- کہ ہندوستان میں اردو کی صورتِ حال کیا ہے---؟

حامد یزدانی: نہیں، نہیں اس بارے میں نہیں۔

قراۃ العین حیدر: اگر پوچھیں گے بھی تو میں جواباً آپ سے پوچھوں گی کی آپ بتائیے پاکستان میں اردو کی صورت حال کیا ہے؟ ہندوستان میں تو بائیس زبانوں میں سے ایک زبان ہے یہ۔ پاکستان کی تو یہ قومی زبان ہے۔ وہاں کیا حالت زار ہے اس کی؟

حامد یزدانی: یہ سوال تو میں کر ہی نہیں رہا۔ میرا سوال تو جمیل الدین عالی صاحب کے ایک بیان کے حوالے سے تھا کہ ---

قراۃ العین حیدر: افوہ! وہی نا کہ قراۃ العین حیدر پاکستان چھوڑ کر ہندوستان کیوں چلی گئی؟ بھئی، اُن سے کوئی پوچھے کہ تقسیم کے وقت تو لاکھوں لوگ ہندوستان سے نقل مکانی کر کے پاکستان آئے تھے تو ایک بے چاری عورت پاکستان سے ہندوستان چلی گئی تو کون سی قیامت آ گئی! اتنے برس ہو گئے، بھول کیوں نہیں جاتے وہ اِس بات کو؟ بات کروں گی ان سے۔ اِسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں وہ۔

حامد یزدانی: طاہر مسعود کی کتاب 'یہ صورت گر کچھ خوابوں کے' میں عالی جی کا جو انٹرویو شامل ہے غالباً اسی میں انہوں کہا ہے کہ پاکستان رائٹرز گلڈ سے انعام نہ ملنے کا دکھ بھی آپ کے پاکستان چھوڑنے کا سبب بنا۔ بہرحال رہنے دیتے ہیں اب اُس قصے کو۔

قراۃ العین حیدر: ہاں، چھوڑ ہی دیں اُن پرانی باتوں کو۔ ویسے میں نے طاہر مسعود کی کتاب دیکھی تو تھی۔ وہ خود اچھے رائٹر ہیں۔

حامد یزدانی: چلیے، واپس آتے ہیں تخلیق کاری کے عمل کی طرف۔ آپ نے متعدد کام یاب ناول اور خوب صورت افسانے لکھے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ناول ہو یا افسانہ اُس کی بنیاد تو کہانی ہی ٹھہرتی ہے۔ یہ بتائیے کہ آپ کے نزدیک کہانی افسانہ کب بنتی ہے؟

قراۃ العین حیدر: کہانی افسانہ اس طرح بنتی ہے کہ آپ نے کوئی واقعہ دیکھا یا کوئی واقعہ آپ کے ذہن میں ہے یا کوئی چیز آپ نے دیکھی تو اگر تو آپ نے اس کا سمپل نیریشن کر دیا، سیدھے سیدھے بیان کر دیا تو وہ تو بس ایک واقعہ ہی ہے ایک anecdote ہے۔ آپ نے بیان کر دیا کہ صاحب میں جا رہا تھا سڑک پر اور میں نے دیکھا کہ ایک عورت پھول بیچ رہی تھی۔ اُس کے پاس کچھ پیسے رکھے ہوئے تھے اور ایک آدمی آیا، اچکا، وہ پیسے اٹھا کر بھاگ گیا اس غریب عورت کے۔ تو یہ افسوس ناک اور المناک واقعہ ہے چھوٹا سا۔ اب تخلیق کار کے طور پر اسی کو آپ کسی اور طریقے سے پیش کریں گے۔ اس بات کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ نے اسے کس ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ میں اس

بات کی چھوٹی سی مثال دیتی ہوں آپ کو۔ یہ حوالہ میرے ذہن سے کبھی نکلتا ہی نہیں۔ خالدہ ادیب خانم بہت بڑی رائٹر تھیں ترکی کی۔ اپنے ایک افسانے میں انھوں نے بس ایک شام بیان کی ہے انقرہ کی، پہلی جنگِ عظیم کے بعد کی جب ترکی جنگ ہارا ہے اور وہاں پر بڑی سخت اداسی اور مایوسی کا سماں ہے اور ایک ہاری ہوئی قوم کی جو حالت ہوتی ہے، پورا ماحول ایسا تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ شام کا وقت تھا اور میں جا رہی تھی سڑک کے اوپر، بازار میں کہ ایک بچہ، نوعمر لڑکا ننگے پیر، سردی کا زمانہ، چیتھڑے پہنے ہوئے اور وہ اخبار بیچ رہا تھا۔ انھیں وہ لڑکا بہت پیارا لگا۔ اسے دیکھ کر انھیں کچھ دکھ بھی ہوا۔ انھوں نے اس سے اخبار لیا اور قیمت سے زیادہ پیسے دیئے۔ اس نے بڑی خودداری سے کہا کہ نہیں اتنے ہی پیسے دیجئے جتنے کا اخبار ہے۔ ان کے پوچھنے پر لڑکے نے بتایا کہ اس کا نام مصطفےٰ ہے۔ اس کے والد جنگ میں مارے گئے ہیں اور یہ کہ وہ اخبار بیچ کر اپنے خاندان والوں کے لیے روزی روٹی کا بندوبست کرتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اخبار کا نام چلاتا ہوا بھیڑ میں کھو گیا۔ اب یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ اس طرح کے ہزاروں واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ ہر جگہ ہو رہے ہیں اور جہاں جنگ ہوگی وہاں ضرور ہوں گے۔ کتنے ایسے واقعات افغانستان میں ہوئے ہوں گے۔ کتنے عراق میں ہوئے ہوں گے۔ اور جانے کہاں کہاں ہوئے ہوں گے۔ ہمارے مشرق میں تو اس قسم کی ٹریجڈی یا اس قسم کا شدید pathos اور ہمت اور مجبوری یہ سب چیزیں موجود ہیں۔ ہم دیکھتے نہیں۔ دیکھتے بھی ہیں تو پرواہ نہیں کرتے کیونکہ ہمیں ان کی عادت پڑ گئی ہے۔ اور اگر پرواہ بھی کرتے ہیں تو ہر کوئی رائٹر نہیں ہوتا جو اس کو لکھے۔ اس ایک منٹ سے واقعے کو خالدہ ادیب خانم نے ایسی دل دوز کہانی میں ڈھال کر پیش کیا ہے کہ میں اس کو بھول ہی نہیں پاتی۔ تو یہ فرق ہوتا ہے۔ دراصل یہ لکھنے والے کے طرزِ بیان پر، اس کی insight پر، بصیرت پر اور اس ایک ایکسٹرا اور خاص چیز پر منحصر ہے جو اسے رائٹر بناتی ہے۔

حامد یزدانی: آپ نے بھی بے شمار لکھے ہیں کوئی ایسا ہی چھوٹا سا واقعہ کیا آپ کو یاد ہے جو افسانہ بن گیا ہو؟

قراۃ العین حیدر: واقعات تو بے شمار ہوں گے مگر فوری طور پر کوئی خاص ذہن میں نہیں آ رہا۔

حامد یزدانی: چلیے کوئی بات نہیں۔ بہت شکریہ کہ آپ نے گفت گو کے لیے وقت دیا۔

قراۃ العین حیدر: بہت بہت شکریہ۔

☆☆☆☆☆

غالب کی ایک غزل

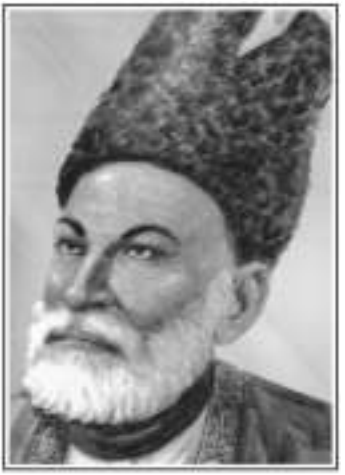

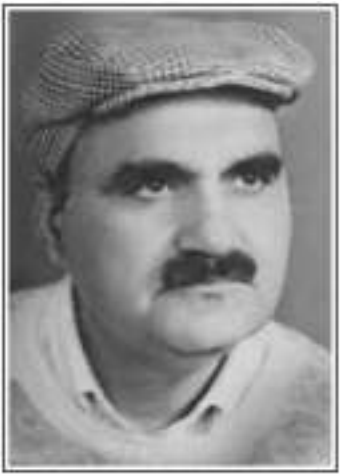

غالب نے اپنی شاعری کے بارے میں کہا تھا:

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

.....

چنانچہ غالب کے اشعار کے لفظی ترجمے پر قناعت نہیں کرنی چاہیے۔ بقول اُس کے، اُس کا ہر لف گنجینۂ معنی ہے اور محض گنجینۂ معنی ہی نہیں بلکہ طلسم ہے گنجینۂ معنی کا طلسم - اس طلسم کو کھولنے کے لیے غالب کے اندازِ بیان کی تفہیم ضروری ہے غالب کو اپنے انداز بیان کی انفرادیت اور اس کے انوکھے پن پر بجا طور پر ناز ہے - فرماتے ہیں:

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

.....

یہی وجہ ہے کہ غالب کے شعروں کی تفہیم اور ان کی تعبیر و تشریح کا سلسلہ، جس کا آغاز غالب کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا، ہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔ اب تک غالب کی اردو اور فارسی غزلیات کی تشریح و توضیح پر کم و بیش 150 سے زائد کتابیں لکھی جا چکی ہیں مگر غالب کی شاعری ایک ایسی دلفریب حسینہ ہے، جس کی زلفِ گرہ گیر کے پیچ و خم ابھی تک پوری طرح نہیں کھلے۔ مشتاقانِ سخن کا

جمیل یوسف

تجسس ابھی تک تشنہ ہے۔

دیوان غالب کا ایک مشہور معروف شعر ہے:

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ پتھر نہیں ہوں میں

....

کسی شارح کو یہ خیال نہیں آیا کہ یہ شعر کسی محبوبہ کو مخاطب کر کے نہیں کہا گیا۔ غالب اللہ تعالیٰ سے کہہ رہا ہے کہ بس تیرے در پر دائم یعنی ہمیشہ کے لیے پڑا ہوا نہیں ہوں ایسی زندگی پر خاک کہ میں اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود ایک پتھر کے برابر بھی نہیں ہوں۔

یہاں کوئی عام پتھر مراد نہیں ہے غالب حجرِ اسود کا ذکر کر رہا ہے جو بیت اللہ یعنی اللہ کے گھر کے دروازے پر نصب ہے یعنی دائم پڑا ہوا ہے۔ خیال رہے کہ حجرِ اسود کے علاوہ دنیا میں کوئی اور پتھر کسی عمارت کے دروازے پر دائم پڑا ہوا نہیں ہے۔ غالب کہتا ہے کہ اس پتھر کو جو اعزاز اور رُتبہ حاصل ہے میں اشرف المخلوقات ہو کر اس سے محروم ہوں تو ایسی زندگی کا کیا فائدہ۔

اگر یہاں پتھر سے مراد حجرِ اسود نہیں ہے اور یہ شعر اللہ تعالیٰ کے بجائے کسی محبوبہ سے مخاطب ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا پتھر ہے جو دائم محبوبہ کے در پر پڑا ہے۔ لفظ دائم سے کیا مراد ہے۔ کیا کسی محبوبہ کو یا اس کے گھر کو اس کے در پر پڑے ہوئے کسی پتھر کو دوام حاصل ہے؟ اور کیا غالب کے عام اندازِ سخن سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ کسی محبوبہ کے در کا پتھر بننا چاہتا ہے۔ عشق کی راہ میں قیس و فرہاد بھی اس کی نظر میں نہیں جچتے:

ہم کو منظور تنک ظرفیِ فرہاد نہیں

اور یہ بھی کہہ دیا:

کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

....

تو کیا وہ قیس و فرہاد کی سطح سے بھی نیچے آ کر کسی حسینہ کے در کا پتھر بننا چاہتا ہے تا کہ اس کے رقیب اس پتھر پر پاؤں رکھ کر اس کے محبوب کے گھر میں داخل ہوں اور وہ پتھر کی طرح بے بسی اور بے چارگی سے دیکھتا رہے کیا غالب کی شاعری سے بطور عاشق اس کی یہی تصویر اُبھرتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ غالب کی اَنا کا تقاضا تو اس سے یہ تک کہلوا دیتا ہے:

اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

....

کیا ایسا شخص کسی محبوبہ کے در کا پتھر بننے کی آرزو کر سکتا ہے جو یہ کہتا ہو کہ:

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

....

باذوق لوگ جانتے ہیں کہ ہر غزل کا ایک خاص رنگ ہوتا ہے۔ ایک خاص موڈ ہوتا ہے، جس میں شاعر غزل کہتا ہے غالب کی

اس غزل کا موڑ ہی حمدیہ اور نعتیہ ہے پہلے چار اشعار اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔ پہلا شعر ہے:

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

.....

اس شعر کی تشریح اوپر کی جا چکی ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہے، جس کے گھر یعنی بیت اللہ پر ایک پتھر یعنی حجرِ اسود دائمی طور پر نصب ہے۔ اگلا شعر ہے:

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

.....

یہ عرضِ حال بھی اللہ کے حضور ہو رہی ہے کہ بس پیالہ یا ساغر نہیں ہوں جو کسی محل میں مختلف ہاتھوں میں گردش کر رہا ہے۔ گردشِ حالات کبھی مجھے کسی گھاٹ اتارتی ہے کبھی کسی گھاٹ۔ مجھے اپنا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

جمیل مجھ کو یہ کن فاصلوں نے گھیرا ہے
کہ ختم ہو نہ سکے عمر بھر سفر میرے

.....

غالب نے اس کیفیت کو اپنے ایک اور شعر میں اس طرح بیان کیا ہے:

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے میرے پاؤں میں، زنجیر نہیں

غزل کا تیسرا شعر تو شروع ہی اللہ سے بات چیت سے ہوتا ہے:

یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے اس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

.....

ہم جب کوئی تحریر لکھتے وقت غلطی سے قلم کی روانی میں کوئی لفظ دو دفعہ لکھ دیتے ہیں تو دوسری دفعہ لکھا ہوا لفظ قلم زد کر دیتے ہیں۔ غالب غلطی سے لکھے ہوئے اس لفظ کو حرفِ مکرر کہہ رہا ہے۔ جسے غیر ضروری سمجھ کر مٹا دیا جاتا ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے اور اللہ کی تخلیق کی ہوئی ہر چیز منفرد اور اکیلی ہے اُس جیسی دوسری کوئی چیز نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک ہی درخت کے پتے جو بظاہر ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ ایک جیسے نہیں ہوتے اسی طرح اس بھری کائنات میں کوئی انسان ہو بہو کسی دوسرے انسان کی طرح نہیں ہے۔ وہ یکتا ہے۔ کوئی اور انسان اس جیسا نہیں ہے، تو پھر وقت یا زمانہ اسے آہستہ آہستہ مٹا کیوں رہا ہے۔ فنا سے آشنا کیوں کر رہا ہے یعنی موت انسان کو کیوں مٹا رہی ہے۔ وہ کوئی حرفِ مکرر تو نہیں ہے کہ اُسے لوحِ جہاں سے مٹا دیا جائے:

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گنہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

.....

اللہ پر ایمان لانے والے اپنے گناہوں کی وجہ سے دوزخ میں رکھے جائیں گے مگر کافروں کی طرح وہ ہمیشہ دوزخ میں نہیں

رہیں گے۔ اپنی سزا کی میعاد پوری کرنے کے بعد انھیں دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا، مگر غالب فریاد کرتا ہے کہ اس کی سزا ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ دراصل غالب کا کہنا ہے کہ وہ زندگی اس طرح بے چارگی کسمپرسی اور محرومی میں گزار رہا ہے گویا دوزخ میں پڑا ہے اور سزا یا عقوبت کی میعاد ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتی حالانکہ وہ محض گناہ گار ہے کافر نہیں ہے کہ ہمیشہ سزا ملتی رہے۔

اس غزل کے اگلے تین اشعار آنحضورؐ کی خدمت میں غالب کی فریاد یا التجا کے طور پر ہیں:

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

.....

ہمارے پیارے نبی حضرت محمدؐ دولت کو حقیر سمجھتے تھے۔ انھیں اپنے فقر پر فخر تھا اس لیے وہ لعل وہ زمرد و زر و گوہر کو عزیز نہیں رکھتے تھے ان قیمتی پتھروں کو اپنے پاس رکھنے کی انھیں کوئی خواہش نہیں تھی۔ شاید زندگی میں ان چیزوں کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہو گا۔ گویا دولت و ثروت کی ان نشانیوں سے متنفر تھے۔ غالب کہتا ہے اے میرے آقا آپ مجھے عزیز کیوں نہیں رکھتے۔ میں تو لعل و زمرد و زر و جوہر نہیں ہوں۔ ایک انسان ہوں اور آپ کا اُمتی ہوں پھر کیوں ناکام و نامراد ہوں آپ کی توجہ اکرام سے کیوں محروم ہوں:

رکھتے ہو تم قدم میری آنکھوں سے کیوں دریغ
رُتبے میں مہر و ماہ سے کم تر نہیں ہوں میں

.....

انسان اشرف المخلوقات ہے اس لیے مہر و ماہ سے رُتبے میرا یقیناً بلند تر ہے۔ آنحضورؐ معراج پر تشریف لے جاتے ہوئے سورج اور چاند پر اپنے قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے تو پھر آپؐ میری آنکھوں کو قدم بوسی کا موقع کیوں نہیں دیتے۔ مجھ سے کیوں گریزاں ہیں مجھے اپنے دیدار اور قدم بوسی سے کیوں محروم رکھا ہوا ہے۔

کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

.....

سفر معراج میں اے حضورؐ! آسمان نے آپ کے مقدس قدموں کے بوسے لیے ہوں گے پھر مجھے قدم بوسی سے کیوں منع کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ اسلام میں کسی انسان کے آگے جھکنا یا اس کے پاؤں پر احترام اور عقیدت سے بوسہ دینا منع ہے کیونکہ ایسا کرنا سجدہ کرنے کے برابر ہے اور اللہ کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرنا حرام ہے بلکہ شرک ہے۔ گناہ کبیرہ ہے۔ غالب اپنی محرومی پر فریاد کرتا ہے کہ آسمان کو آپؐ کے قدم چُومنے سے منع نہیں کیا گیا۔ مجھے کیوں منع کیا گیا ہے۔ کیا میں آسمان کے برابر بھی نہیں ہوں۔

☆☆☆☆☆

انور شعورؔ... سہل ممتنع کا شاعر

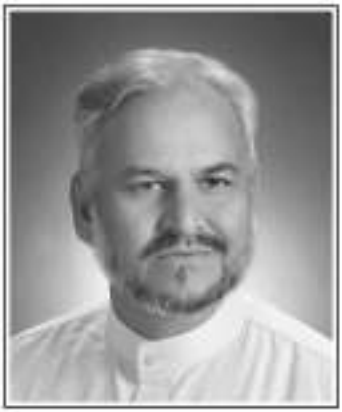

بیس ویں صدی کے اُردو ادب میں جن سخن وروں نے اپنی شاعری کی بنیاد عہدِ موجود کے مسائل وافکار پر رکھی، اُن میں عہدِ حاضر کے چند سخن وروں کے بعد انور شعورؔ کا نام سب سے زیادہ معتبر، اہم اور سنجیدہ ہے۔ انور شعورؔ کی شاعری تلخ و شیریں تجربات، عمیق مشاہدات، شدید جذبات اور نازک احساسات کی آئینہ دار ہے۔ اِن کے شعر عام فہم، سلیس اور سادہ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ناقدینِ فن و ہنر، ماہرینِ اُردو ادب اور قارئینِ شعروسخن اِنھیں سہلِ ممتنع کا شاعر ماننے لگے ہیں۔ اِن کے پُرتاثیر اشعار پوری دنیا میں سفر کر رہے ہیں۔ عالمی سطح پر اِن کی شہرت کا سبب یہی عمدہ شاعری ہے۔ اِن کا شمار پاکستان کے نمائندہ سخن وروں میں ہوتا ہے۔ اِن کے اشعار کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ سنتے ہی دل میں اُتر جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

اچھا خاصا بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتا ہوں
اب مَیں اکثر مَیں نہیں رہتا تم ہو جاتا ہوں

☆

دل کی کلی کِھلے کئی موسم گزر گئے
اُس لب سے لب مِلے کئی موسم گزر گئے

☆

دُکھ ہے تو آپ سے ہے، دَوا ہے تو آپ سے
اب زندگی میں کوئی مزا ہے تو آپ سے

.....

انور شعورؔ نے غزل کے پیکر میں نہ صرف اپنے تجربات و مشاہدات کے حسین رنگ بھر دیئے ہیں بلکہ انہوں نے اپنے جذبات (غصہ، پیار، نفرت، ڈر اور خوف) کی

شاعر علی شاعر

شدت کو بھی غزل کا حصہ بنا دیا ہے۔ انھوں نے بار بار اپنے آپ کو دریافت کرنے کے عمل سے گزارا ہے۔ ہم ان کی شاعری میں ان کو شدت پسند پاتے ہیں یعنی اگر وہ اپنے اشعار میں کسی کا انتظار کرنے کا نقشہ کھینچتے ہیں تو خود کو اس قدر مضطرب و بے چین پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے ان کا اضطراب و اضمحلال تصویر بن کر آ جاتا ہے۔ اگر انہوں نے کسی کی دید کا ذکر کیا ہے تو اسے عمومی یا سرسری طور پر نہیں لیا بلکہ محبّ عارفی کا یہ شعر ان کی ہر بار اور ہر نظر کی دید پر صادق آتا ہے:

کل میں نے محبّ اس کو عجب طور سے دیکھا
آنکھوں نے تو کم دل نے بہت غور سے دیکھا

.....

انور شعورؔ اگر محبوب کی بے وفائی کا ذکر کرتے ہیں تو اس قدر دعویٰ اور دلیل سے کام لیتے ہیں کہ سننے، پڑھنے اور سمجھنے والے لاجواب ہو کر رہ جاتے ہیں، انہیں کوئی جواب نہیں بن پڑتا۔ ملاحظہ ہو:

نہ بیتی تھی کبھی جس کی چاند رات اُس کی
سہاگ رات ہمارے بغیر بیت گئی

.....

وہ اپنی عاشقی، وابستگی، پیار و محبت کا بیان دیتے ہیں تو خیال کو اس قدر سجا کر پیش کرتے ہیں کہ نیا معلوم ہوتا ہے۔ ان کے اشعار میں تخیل کی بلند پروازی اور خیال کی ندرت آپ اپنا جواب ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

اِس تعلّق میں کہاں ممکن طلاق
یہ محبت ہے ، کوئی شادی نہیں

.....

انسان سیکڑوں سال سے اپنے آپ کو دریافت کرنے میں مصروفِ عمل ہے۔ مگر اس کا کوئی امکان نہیں کہ یہ دریافت مکمل ہو سکے۔ انور شعورؔ کا کلام پڑھ کر ہم انہیں با آسانی دریافت کر لیتے ہیں۔ وہ نرم لہجے کے شاعر ہیں، بات کو بہت سلیس، سادگی اور سہل انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ عام فہم بات کرنے کا فن جانتے ہیں، ان کو اپنی بات مؤثر بنانے کا ہنر بھی بہ خوبی آتا ہے۔ وہ عام سی بات کو اس طرح منظوم کرتے ہیں کہ بہت بڑی معلوم ہوتی ہے اور بہت بڑی بات کو اس سادگی اور سہل انداز سے کہہ دیتے ہیں کہ سننے والا اس کی اتھاہ گہرائیوں میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

تم اک مرتبہ کیا دکھائی دیئے
مرا کام ہی دیکھنا ہو گیا

☆

جو نہ آیا کبھی دو چار گھڑی کی خاطر
زندگی ہم نے گزاری ہے اُسی کی خاطر

☆

وہ ہاتھ میرے ہاتھ میں آیا تو دفعتہً
اک سنسنی سی دوڑ گئی جسم و جان میں

.....

انور شعورؔ کو جدید غزل کہنے والوں کی فہرست میں شامل کرنے کا میرا مقصد یہ کہنا نہیں

ہے کہ وہ سب سے الگ تھلگ اپنا شعری راستہ چل رہے ہیں، وہ تو انسانوں کے درمیان رہ کر، اس معاشرے و سماج سے وابستہ ہو کر، اپنے اِرد گرد کے ماحول و فضا کا جائزہ لیتے ہوئے انسانی رویوں کو لکھ رہے ہیں۔ زندگی کے اُتار چڑھاؤ، نشیب و فراز میں پیش آنے والے تلخ و شیریں تجربات کو بیان کرتے ہیں۔ عمیق مشاہدات کو اس عمدگی سے پینٹ کرتے ہیں کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔ وہ انسان کے بدلتے ہوئے رویوں اور کردار کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں کہ انسانوں نے اپنے چہروں پر کیسے کیسے چہرے سجا رکھے ہیں، ان کے اشعار انہیں بے نقاب کرتے ہیں۔ ان سب کے ساتھ ساتھ وہ اپنے کرب و الم، تنہائی، زمانے کی بے اعتنائی، یاروں کی بے وفائی، محبوب تک نارسائی، ہجر و فراق کے دکھ، انتظار کے کرب اور حالات کی ستم ظریفی کو اشعار میں ڈھال رہے ہیں۔ انہیں انسانی قدر و قیمت کی ارزانی، اس کی بے وقعت ہوتی زندگی کا دکھ بے چین کیے دیتا ہے۔ انہوں نے اپنے ان تمام محسوسات اور نازک احساسات کو اپنی شاعری میں سمو دیا ہے۔ ان کے اظہار میں بڑی فن کاری، ہنرمندی اور چابک دستی سے کام لیا ہے تبھی قارئینِ شعر و سخن ان کے کلام کے گرویدہ ہیں اور سامعینِ محافلِ مشاعرہ ان کی آمد کے منتظر رہتے ہیں۔ ان کے اشعار برجستہ، پُر معانی اور مضمون و احساس آفرینی لیے ہوئے ہیں جن کی نثر کی جائے تو شعری کی صورت قائم رہتی ہے۔ اسی کو سہلِ ممتنع کہتے ہیں اور انور شعورؔ کی شاعری کی پہچان یہی ہے، اسی پہچان سے ان کی انفرادیت قائم ہوئی ہے اور اسی طرزِ نگارش نے انہیں صاحبِ اُسلوب شاعر بنا دیا ہے۔ ان کے اشعار کو ان کے نام کے بغیر بھی پڑھا جائے تو پہچان لیے جاتے ہیں کہ یہ اشعار انور شعورؔ کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کے نہیں ہو سکتے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

صرف اُس کے ہونٹ کاغذ پر بنا دیتا ہوں میں
خود بنا لیتی ہے ہونٹوں پر ہنسی اپنی جگہ

☆

ایک آواز پہ آ جاؤں گا
جیسی حالت میں بیٹھا ہوں

☆

کچھ بھی مری آنکھوں کو سجھائی نہیں دیتا
جب سے تجھے دیکھا ہے، دکھائی نہیں دیتا

☆

اب آ گئے ہو تو کچھ دیر دیکھ لینے دو
کبھی کبھی تو یہ چہرہ دکھائی دیتا ہے

☆

یہ جانتے ہوئے بھی گزاری ہے زندگی
ہم زندگی کے ہیں نہ ہماری ہے زندگی

پاکستان میں سہلِ ممتنع کہنے والوں کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں کے برابر بھی نہیں ہے۔

ناصر کاظمی اور جون ایلیا کے بعد اس میدان میں انور شعورؔ کا نام سب سے زیادہ معتبر اور نمایاں ہے۔ اب تو سہلِ ممتنع اور انور شعورؔ لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔

انور شعورؔ کا شعری سفر اور سہلِ ممتنع کے تجربات روز بہ روز ارتقائی منازل طے کر رہے ہیں۔ ان کے قارئین اور چاہنے والوں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان کی غزل کے چار مجموعے ''کلیاتِ انور شعورؔ'' میں یک جا شائع ہو گئے ہیں اور پانچ واں شعری مجموعہ ''آتے ہیں غیب سے'' حال ہی میں شایع ہوا ہے، اس کے علاوہ پاکستان کے سب سے بڑے اخبار ''روزنامہ جنگ'' میں حالاتِ حاضرہ پر لکھے گئے ان کے ہزاروں قطعات بھی سہلِ ممتنع کی عمدہ مثالیں ہیں اور ان کے قارئین بھی لاکھوں کی تعداد میں ہیں جو انور شعورؔ کے فین ہیں اور پھر ان کے اشعار پورے دنیا میں سفر کر رہے ہیں۔ اہلِ ادب ان کے نمائندہ اشعار کو اپنی تحریروں، تقریروں اور گفتگو میں برمحل استعمال کرتے ہوئے امثال میں پیش کرتے ہیں۔ کوئی شعری انتخاب یا کنز الاشعار ایسا نہیں جس میں انور شعورؔ کے اشعار و غزلیات کو منتخب نہ کیا گیا ہو، ان کو بہترین اور دل موہ لینے والی شاعری کی بنیاد پر برصغیر پاک و ہند کے علاوہ یورپ کے بڑے شہروں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں مدعو کیا جاتا ہے اور وہ اہلِ ادب کی محبتیں، داد و تحسین کی دولتیں، چاہنے والوں کی محبتیں، ہم عصروں کی رفاقتیں اور عز و شرف کے خزانے سمیٹ کر لوٹتے ہیں۔

مذکورہ بالا تمام باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ گمان یقین میں بدل سکتا ہے کہ انور شعورؔ کی شہرت کا گراف اتنا بڑھ جائے گا کہ یہ سہلِ ممتنع کے نمائندہ شاعر قرار دے دیے جائیں گے۔ انور شعورؔ جس دیانت و خلوص اور محنت و ریاضت، لگن و جستجو سے شعر کہہ رہے ہیں وہ ناقابلِ فراموش اور قابلِ صد ستائش ہے۔ ان کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ پتھر پر لکیر کی مثال ہو جاتا ہے جس طرح پتھر کی لکیر کو مٹایا نہیں جا سکتا اسی طرح انور شعورؔ کے کلام کی صفات کو بھلایا نہیں جا سکتا ہے۔ ان کے نام اور تخلیقی کام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

انور شعورؔ نے اُردو غزل کو روایت سے بھی جڑے رکھا ہوا ہے اور اس میں نت نئے رنگ بھر کر مختلف زاویوں سے طبع آزمائی اور خیالات کو ندرت سے پیش کر کے جدید بنا دیا ہے۔ وہ گل و بلبل، دشت و گلزار اور لب و رخسار کے قصے بھی بیان کرتے ہیں مگر ان کی شاعری کے آئینے میں یہ تمام تصویریں جوانی اوڑھے نظر آتی ہیں۔ ان کا معنوی حسن جوبن پر ہوتا ہے۔ وہ عمدہ الفاظ کے استعمال، نئی نئی تراکیب اور عام فہم جملوں کے چناؤ سے کلام میں جو روانی اور سلاست پیدا کرتے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے۔ ان کی عام فہم بول چال کا مفہوم سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ ان کے ہاں شعریت ہوتی

ہے، لفاظی نہیں ملتی، ان کے کلام میں فصاحت و بلاغت ہی ان کا طرۂ امتیاز ہے جس کا ابلاغ ہر عمر اور ہر ذہن کے قاری تک باآسانی ہو جاتا ہے۔ کسی شاعر کے کلام کی یہ خوبی اسے اس کے ہم عصروں سے منفرد و ممتاز کرتی ہے اور اس کے لیے انفرادیت کا نشانِ عظمت بنتی ہے۔ حسرت کا یہ شعر دراصل ان کی شاعری پر صادق آتا ہے:

شعر دراصل وہی ہیں حسرت
جو سنتے ہی دل میں اُتر جائیں

.....

انور شعورؔ شاعری کرتے وقت شعر کی فضا میں کھو جاتے ہیں، اس کے ماحول میں رنگ جاتے ہیں، وہ شعر کی وادیوں میں اُتر کر اس کے حسن کو اپنا لیتے ہیں انور شعورؔ کے کلام کو پڑھ کر خوش گوار حیرت ہوتی ہے کہ وہ اُن شعرا میں سے نہیں ہیں جو شاعری کو اپناتے ہیں بلکہ ان کا تعلق ان سخن وروں سے ہے جن پر شاعری کی دیوی نہایت مہربان ہو جاتی ہے اور شاعری جن کو اپنا لیتی ہے۔ شاعری نے جب سے انور شعورؔ کو اپنا بنا لیا ہے، تب سے وہ بھی شاعری کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں۔ اب یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش دلی سے جیون بسر کر رہے ہیں۔ چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں:

سوال ہی نہیں دنیا سے میرے جانے کا
مجھے یقین ہے جب تک کسی کے آنے کا

☆

میری صورت اُنھیں پسند نہیں
کیا یہ میرا قصور ہے کوئی

☆

پڑے پڑے مجھے آتا ہے یہ خیال شعورؔ
نہیں ہے کیا مرا کمرہ مکان میں شامل

☆

اے روشنی کے شہر! ترا وہ مکیں ہُوں میں
جس کے مکاں میں ایک دیا بھی نہ آ سکا

.....

زہے نصیب رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی نے ایسے عبقری، بڑے اور نمائندہ شاعر کی کلیات شائع کرنے کا شرف حاصل کیا ہے۔ کلیات انور شعورؔ میں ان کی غزلوں کے چار مجموعے ''اندوختہ''، ''مشقِ سخن''، ''می رقصم'' اور ''دل کا کیا رنگ کروں'' شامل ہیں جو، نہ صرف زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے بلکہ بہت جلد اُن کے ایڈیشن فروخت بھی ہو گئے۔ خوشی و اطمینان کی بات ہے کہ انور شعورؔ کا شمار اُن شعرا میں ہوتا ہے جن کی کتابیں قارئینِ شعر و ادب خرید کر پڑھتے ہیں۔

میری خواہش تھی کہ میں اپنی تمام تر صلاحیتوں اور تجربات کو بروئے کار لا کر بہ حیثیت پبلشر کلیات انور شعورؔ کا خوب صورت، دیدہ زیب اور ناقابلِ فراموش ایڈیشن شائع کروں۔ الحمدللہ میں اس کوشش میں بڑی حد تک کام یاب ہوا ہوں جس کے کریڈٹ میں مجھے ان کی غزلوں کا پانچ واں مجموعہ شائع کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔

☆☆☆☆☆

گلابی جذبوں کی ترجمان ۔ پروین شاکر

یہ 1982ء کی بات ہے سنٹرل سپیریئر سروسز میں نوکری کے لیے حکومت پاکستان نے امتحان کا انعقاد کیا ہوا تھا۔ اس امتحان میں ایک لڑکی بھی شریک تھی۔ جب سوال نامے میں پوچھے گئے سوالات پہ اس نے نظر دوڑائی تو ایک سوال کو پڑھ کر چونک کر رہ گئی۔ یہ سوال اسی لڑکی کی شاعری سے متعلق تھا۔ جی ہاں! وہ سوال پروین شاکر کی شاعری پر تھا اور وہ لڑکی پروین شاکر تھی۔ بتانے کی ضرورت نہیں کہ پروین شاکر کو ان کی شاعری میں عمر بھر اعزازات اور انعامات سے نوازا جاتا رہا۔ درست ہے کہ ہر ایسا موقع ان کے لیے خوشی اور مسرت کا باعث بنا ہوگا۔ مگر اس قسم کی خوشی کے بیان کے لیے انگریزی زبان کی مروجہ اصطلاحات Happiness اور Joyfullness تو ہوسکتی ہیں لیکن Elation نہیں۔ Elation یعنی اچانک ملنے والی خوشی کا مقابلہ کوئی دوسری خوشی نہیں کرسکتی۔ یہاں تک کہ نوبل پرائز کا حصول بھی وہ خوشی نہیں دے سکتا۔ کیونکہ اس میں بھی اچانک ملنے والی خوشی کا عنصر مفقود ہوتا ہے۔ تو سنٹرل سپیریئر سروسز کے اس امتحان میں پروین شاکر اسی Elation سے ہمکنار ہوئی تھی۔ تاہم اس طرح کی ملنے والی خوشی کو وہ خوش قسمت انسان کسی انتہائی 'اپنے' سے فوری طور شیئر کرنا چاہتا ہے۔ مگر پروین شاکر کا انتہائی 'اپنا' تو ان سے اپنی راہیں جدا کر چکا تھا۔ یوں یہ Elation بھی پروین شاکر کی رنج والم میں بہتی زندگی کا دھارا نہ بدل سکی۔ مگر انہوں نے اپنے آپ کو کچھ دھوکہ دیا نہ اپنے پڑھنے والوں سے کوئی بات مخفی رکھی۔ بلکہ اپنے رنج والم کو نسوانی وقار کے ساتھ اپنی شاعری میں بیان کر دیا۔

عامر رضوی

ہاتھ میرے بھول بیٹھے دستکیں دینے کا فن
بند جب سے مجھ پہ اس کے گھر کا دروازہ ہوا

.....

اپنے اس انداز سے پروین شاکر ان نسوانی جذبوں کا ترجمان نظر آتی ہیں جو ہمارے ہاں کی مشرقی خواتین یا تو دل میں چھپائے چھپائے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جاتی ہیں یا زیادہ سے زیادہ کبھی کبھار اپنی ذاتی ڈائریوں میں لکھ لیتی ہیں۔ یہ بات نہیں کہ پروین شاکر اُردو زبان کی پہلی شاعرہ تھیں؛ جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مہ لقا چندا بائی اور لطف النساء نامی دو خواتین کا ذکر شاعرات ہونے کے حوالے سے ملتا ہے۔ اور یہ کہ یہ دونوں صاحب دیوان تھیں۔ مگر خوف اور جھجک کا عالم ان کی شاعری کو محیط کیے ہوئے ہے۔ تاہم 1950ء کے بعد سے زہرہ نگار اور ادا جعفری نے نسوانی شاعری میں اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا۔ مگر جب 1976ء میں ایک چوبیس سالہ حسین و جمیل لڑکی پروین شاکر کی کتاب ''خوشبو'' سامنے آئی تو اس نے اردو ادب کے در و بام کو ہلا کر رکھ دیا۔ انہوں نے بتایا کہ

ماں سے ہجر کے غم کو کیا کہیں کہ خود سے بھی
اتنی کچی عمر کی لڑکیاں نہیں کھلتیں

پھر واضح کر دیا کہ

حسن کے سمجھنے کو عمر چاہیے جاناں
دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں

.....

یہ ان کی کتاب خوشبو ہی تھی جس میں انھوں نے کچی عمر کی لڑکیوں سے لے کر ہر عمر کی عورت کے نسوانی جذبوں کو زبان عطا کی۔

پروین شاکر 24 نومبر 1952ء میں کراچی میں پیدا ہوئیں۔ ان کا آبائی تعلق بہار کے ایک گاؤں چندی پٹی سے ہے۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت ان کا خاندان کراچی میں آن آباد ہوا۔ پروین شاکر کی تعلیم کراچی ہی کی ہے۔ وہیں سے انہوں نے گریجوایشن اور پوسٹ گریجوایشن کی ڈگریاں لیں۔ پوسٹ گریجوایشن میں ان کے مقالے کا عنوان ''جنگ میں میڈیا کا کردار'' تھا۔ 1972ء میں انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد انہوں نے عبداللہ گرلز کالج میں انگریزی ادب کی تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ 1982ء میں وہ سی ایس ایس کے امتحان میں شریک ہوئیں اور اس میں انہوں نے دوسری پوزیشن حاصل کی۔ علاوہ ازیں انہوں نے ایک ڈگری بینکنگ ایڈمنسٹریشن میں بھی حاصل کی۔ سی ایس ایس پاس کرنے کے بعد سول سروسز میں ملازمت حاصل کر لی اور محکمہ کسٹمز میں بطور کلیکٹر تعینات ہو گئیں۔ ان کی شادی ان کے خالہ زاد ڈاکٹر ناصر علی سے ہو گئی مگر یہ ایک ناکام شادی ثابت ہوئی اور 9 برس بعد طلاق کی صورت میں انجام پذیر ہوئی۔ پروین شاکر پیدائشی طور پر ایک فنکارہ تھیں۔ شاعری ان کے رگ و پے میں بسی ہوئی تھی۔ مگر اپنے

سے پہلے کی شاعرات اور ادب نگار خواتین کی طرح خود کو روایتوں کے پنجرے میں قید نہیں رکھ سکتی تھیں۔ جبکہ ڈاکٹر کی سوچ روایتی بندھنوں سے آزاد نہ ہو سکی۔ یوں دونوں کی راہیں ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئیں۔ مگر یہ جدائی بھی پروین شاکر کے دکھوں کا مداوا ثابت نہ ہو سکی۔ بلکہ یہ دکھ چوکھا بڑھ گیا جب پروین شاکر کو کہنا پڑا۔

وہ مجھ کو چھوڑ کر جس آدمی کے پاس گیا
برابری کا بھی ہوتا تو صبر آ جاتا

....

پروین شاکر نے اپنی شاعری میں خود پہ گزرنے والے غم کی روداد بیان کی اور خوب کی۔ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری ضخامت پہ مشتمل ہے۔ مگر ضخیم ہونے کی بنا پر اس کے معیار پہ کوئی حرف نہیں آتا۔ پروین شاکر کی شاعری کے نقاد ان کی شاعری پہ داخلی یا Subjective کی کیفیت طاری ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ درست ہے کہ ان کی شاعری میں ہمیں جابجا ہجر اور رومانوی تنہائی کی کیفیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس معاشرے کی معاشی ناہمواریوں کا ذکر نہ ہونے کے برابر ملتا ہے۔ سادہ لفظوں میں یہ کہ ان کی شاعری میں ذات کا ذکر تو پایا جاتا ہے لیکن غم دنیا کا تذکرہ نہایت کم ہے۔ مگر اس کی ایک ٹھوس وجہ ہے اور اس کے لیے ہمیں محبت کے حوالے سے مرد اور عورت کی نفسیات کو سمجھنا ہوگا۔ مرد کی زندگی میں رومانوی محبت اس کی زندگی کے بہت سے مختلف حصوں میں سے ایک حصہ ہوتی ہے۔ جبکہ عورت کی زندگی میں محبت اس کی کل زندگی کا احاطہ کیے ہوتی ہے۔ اور یوں عورت کی شاعری میں داخلی کیفیت یا Subjective کیفیت کا نمایاں رنگ نظر آنا ایک قدرتی امر ہے۔

بات کچھ یوں بھی ہے کہ بہت سے اشعار ایسے بھی ہیں جو پروین شاکر کے نہیں ہیں اور ان سے منسوب کر دیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر۔

وہ عکس بن کے میری چشم تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

....

دراصل یہ شعر ایک خاتون بسمل صابری کا ہے۔ لیکن پروین شاکر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اب یہ شعر دیکھئے۔

طلاق دے تو رہے ہو غرور اور قہر کے ساتھ
میرا شباب بھی لوٹا دو میرے مہر کے ساتھ

....

یہ شعر حقیقت میں ساجن بھٹی کا ہے لیکن اسے بھی پروین شاکر کا کہا جاتا ہے۔ اسی طرح۔

آئینہ دیکھ کر خیال آیا
تم مجھے بے مثال کہتے تھے

یہ شعر ایک خاتون امۃ الروف کا ہے اور یہ بھی پروین شاکر کے نام سے مشہور ہے۔

جیسا کہ اوپر تحریر کیا جا چکا ہے کہ 24 سالہ

پروین شاکر کی کتاب خوشبو نے اردو ادب کے بام و در کو ہلا کر رکھ دیا تو اس کتاب کی مقبولیت کی بڑی وجہ ایک نوعمر لڑکی کے ان گلابی جذبوں کا بیان ہے جس میں زندگی اپنی تمام تر تلخیوں کے باوجود انتہائی خوبصورت نظر آتی ہے۔ اور پھر جب 1980ء میں ان کی اگلی کتاب ''صد برگ'' منظر عام پر آتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی شاعری اپنے چنچل دور سے نکل کر پختگی کے دور میں داخل ہو رہی ہے۔ تاہم یہ کتاب ''خوشبو'' کی طرح کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی خوشبو نے الہامی صورت میں وارد ہو کر خود کو پروین شاکر سے لکھوایا؛ جبکہ ''صد برگ'' پروین شاکر نے اپنی عمر کو پختگی کے دور میں داخل ہوتے دیکھ کر ایک ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے لکھی۔ ان کی وہ شاعری جس میں خیالات کی برجستگی پائی جاتی ہے، دل کو چھو جاتی ہے۔ ذرا یہ شعر دیکھئے۔

جسے میں چھوڑ دیتی ہوں اُسے میں بھول جاتی ہوں
پھر اس ہستی کی جانب میں کبھی دیکھا نہیں کرتی

اس کے برعکس اب ذرا یہ ملاحظہ ہو۔

تمام رات میرے گھر کا ایک در کھلا رہا
میں راہ دیکھتی رہی وہ راستہ بدل گیا

.....

صاف نظر آتا ہے کہ دونوں اشعار ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ کہنے کو قاری اعتراض کر سکتا ہے کہ کیسے پروین شاکر پہلے شعر میں کہی گئی اپنی بات سے دوسرے شعر میں پھر رہی ہیں۔ مگر وہ جو Wordsworth نے کہا ہے:

"Poetry is spontaneous overflow of powerful feelings."

یعنی شاعری انتہائی زور آور جذبات کا بے ساختہ اظہار ہے۔

چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پروین شاکر کی یہ ادبی ایمانداری ہے کہ انہوں نے جب جیسا محسوس کیا اسے من و عن بیان کر دیا۔

پروین شاکر نے اپنی شاعری میں نئے تجربات بھی کیے۔ مثال کے طور پر آزاد نظم ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ ان سے پہلے آزاد نظم کا اردو میں بیان کم کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ قاری کی دلچسپی ان کی آزاد نظم میں اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب وہ اس میں مکالمہ کی سی ادائیگی سے دوچار ہوتا ہے۔ پھر انگریزی اصطلاحات کا استعمال ان کی شاعری کو ایک الگ اور منفرد جہت عطا کرتا ہے۔ اور یہ کہ انگریزی اصطلاحات کا استعمال ان کی شاعری میں بھرتی کے سے انداز میں سامنے نہیں آتا، بلکہ وہ ان کا استعمال نہایت شستہ اور برجستہ انداز میں کرتی ہیں۔

شاعری کے علاوہ پروین شاکر نے اردو نثر میں کالم نگاری کے طور پر طبع آزمائی کی۔ ضمناً عرض ہے کہ ان کی کتاب ''گوشۂ چشم'' ان کے کالموں کا مجموعہ ہے۔ خوشبو، صد برگ

اور گوشہ چشم کے علاوہ کف آئینہ، خود کلامی اور انکاران کی تصانیف میں شامل ہیں۔ ان کے فن کی انفرادیت پر بات کرتے ہوئے یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ "لڑکی" اور "لڑکیاں" کی اصلاحات کا شاعری میں استعمال انہوں نے ہی شروع کیا۔ اب ذرا یہ شعر دیکھئے۔

لڑکیوں کے دکھ عجیب ہوتے ہیں سکھ اس سے عجیب
ہنس رہی ہیں اور کاجل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

....

ان کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ ان کی پہلی ہی کتاب "خوشبو" کو 1976ء میں آدم جی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 1990ء میں انہیں پرائیڈ آف پرفارمنس سے نوازا گیا۔ اور پھر انتہائی دکھ کے ساتھ یہ کہ 42 سالہ پروین اپنے فن میں عروج کی طرف گامزن تھیں کہ 26 دسمبر 1994ء میں کار ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں اپنے چاہنے والوں کو داغ مفارقت دے گئیں۔ ان کی فنی خدمات کو سراہتے ہوئے پاکستان پوسٹ آفس نے 2013ء میں دس روپے کا ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔ ہر سال ان کی یاد منانے کے لیے نومبر، دسمبر میں پروین شاکر میلے کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اسلام آباد کے F-7 کی سڑک کو جس پر پروین شاکر کو حادثہ پیش آیا تھا ان کے نام سے "پروین شاکر روڈ" منسوب کر دیا گیا۔

پروین شاکر نے اپنے پسماندگان میں اکلوتا بیٹا مراد علی چھوڑا ہے۔ معاف فرمائیے گا غلط کہہ گیا۔ ان کے پسماندگان میں اردو کی ایک نئی اور اچھوتی صنف بھی شامل ہے۔ شاعری کی یہ صنف خواتین خصوصاً نوعمر لڑکیوں کے ان گلابی احساسات کو بیان کرتی ہے جن کا ذکر اس سے پہلے شجرہ ممنوعہ سمجھا جاتا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ جیسے ہی کوئی خاتون شاعرہ ان موضوعات پر کچھ کہنا چاہتی تھی تو نقاد پنجے جھاڑ کر انہیں آن لیتے تھے۔ لیکن پروین شاکر کے معاملے میں وہ ایسا نہ کر سکے۔ اس کی وجہ پروین شاکر کا وہ پروقار انداز تھا جس پہ انھوں نے کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ انھوں نے پاکستان ہی میں نہیں بلکہ باہر کے ملکوں میں بھی کبھی مشاعروں میں شرکت سے اجتناب نہیں کیا۔ یہ ان کا وقار ہی تھا کہ کبھی بھی کسی منفی تنقید کا نشانہ نہ بن سکیں۔ ایک بات کہتا ہوں -- وہ یہ کہ حسن کے بہت سے زاویے ہوتے ہیں جو اس کی پہچان کا باعث بنتے ہیں مگر اس کا سب سے عظیم زاویہ کسی حسین کا اپنی جوانی میں موت کو گلے لگانا ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کے شاعر جان کیٹس کو دنیا آج تک نہیں بھولی۔ اس لیے کہ ان کا انتقال عین جوانی کے دنوں میں ہوا تھا۔ 42 سالہ پروین شاکر اپنی جواں مرگ موت کی بنا پر اپنے قاریوں کے ذہنوں پہ اپنی جوانی اور امنگوں سے بھرپور تصویر چھوڑ گئی ہیں۔ جیسے وہ کہہ رہی ہوں۔

عکس خوشبو ہوں بکھرنے سے نہ روکے کوئی
اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی

☆☆☆☆☆

غزل

رُخ حیات کا غازہ ، مرا غبار تو ہو
مِرے وقار میں شاملِ ترا وقار تو ہو

مِرے نفس سے دَمِ عندلیب شرمائے
مگر چمن میں مِری کوئی شاخسار تو ہو

ہر آہ نغمۂ نصرت کی گونج بن جائے
مگر کہیں کوئی گیتوں کا آبشار تو ہو

عمل کو فکر ملے ، فکر کو عمل ، لیکن
شکارِ کار کو حاصل شریکِ کار تو ہو

دکھا تو دُوں کہ مِرے دِل پہ زخم کتنے ہیں
مگر کسی کی عنایات کا شمار تو ہو

حیات عرصۂ محشر سے کم نہیں خالد
مگر کسی کو قیامت کا انتظار تو ہو

خالد احمد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لیے پھرتا تھا جو در در مجھ کو
بھول سکتا ہے وہ کیونکر مجھ کو

غزل

پوچھوں گا میں احباب سے یہ بات ادب سے
مابین یہ رنجش کی گھڑی آ گئی کب سے

ناراض ہیں کچھ لوگ تو راضی بھی ہیں کتنے
ملتا ہوں محبت سے میں اس شہر میں سب سے

خوابوں کی وضاحت کے لیے کس سے ملیں ہم
تقریب نہیں کوئی بھی گزری ہوئی شب سے

آپس میں کہیں آنکھ ملاتے ہی نہیں ہم
جذبات بھی ایسے ہیں کہ لگتے ہیں عجب سے

کچھ ذوقِ سماعت کا ہوا اُن کو تکلف
کچھ ہم بھی ہوئے جاتے ہیں اشعار بلب سے

مطلوب ہوئے آپ سرِ بزمِ نگاراں
عزت ملی مجھ کو بھی بہت حسنِ طلب سے

کردار کی توفیق ہو تو جگ میں ہے عزت
اعزاز کبھی ملتا نہیں نام و نسب سے

ثاقبؔ میں گنہ گار معافی کا ہوں طالب
ڈرتا ہوں جو ہر وقت ہی مالک کے غضب سے

آصف ثاقب

غزل

اگرچہ ترکِ تعلق سے دکھ بڑا پہنچا
اُسے بھی اور مجھے بھی سکون سا پہنچا

ہزار وسوسے آئے دماغ میں تاہم
کل انتظار تھا جس کا وہ آج آ پہنچا

نہیں ملا کبھی یکمشت مختتانہ ہمیں
ہمیشہ حصّہ ہمارا ذرا ذرا پہنچا

عبادتیں تو بہت کی ہیں شیخ جی تم نے
تمھاری ذات سے بندوں کو فیض کیا پہنچا

مجھے جگا کے وہ آرام کر رہے ہوں گے
مری دعا اُنھیں اے صبح کی ہَوا! پہنچا

ہوئی تھی صرف غزل بھیجنے کی فرمائش
مگر شعور بہ نفسِ نفیس جا پہنچا

انور شعور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اظہار کی اُلجھن نے تراشے نئے بندھن
ہر صوت کو ہم صورتِ الفاظ کیا ہے

غزل

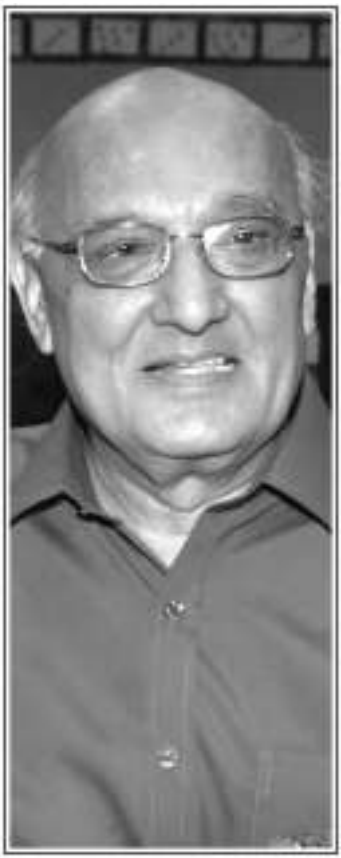

امجد اسلام امجد

گر ، یہاں پر خدا نہیں ہوتا
کوئی بھی سلسلہ نہیں ہوتا

ہو گا دیکھو یہیں کہیں موجود
کوئی لمحہ فنا نہیں ہوتا

وہ ہمیں دیکھتا ہے اُس پل بھی
جب کوئی دیکھتا نہیں ہوتا

عکس ہوتا ہے اُس گھڑی بھی جب
سامنے آئنہ نہیں ہوتا

اُس کو ملتا نہیں وہ باہر بھی
جس کے اندر خدا نہیں ہوتا

کیسے کہہ دیں ، کبھی نہیں ہو گا
وہ جو اب تک ، ہُوا نہیں ہوتا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مرے حالات مجھ کو چُھو نہ پائیں
مجھے ہر حال میں انسان رکھنا

غزل

تُو صید کر سکے مری سوچیں نہیں نہیں
ہمسر مرے گماں کا بھی تیرا یقیں نہیں

اک خبط چھوٹنے سے خوشی بھی ہوا ہوئی
اک ربط ٹوٹنے پہ مرا دل غمیں نہیں

گزری تمام عمر اسی گرم و سرد میں
اوپر فلک نہیں کبھی نیچے زمیں نہیں

چلتا ہے حکم اور کسی کا پسِ نگاہ
تاجِ شہی میں شانِ شہی کا نگیں نہیں

اک خوابِ شہرِ شوق کا دشمن ہے اصل کون
کہہ دے گا کان میں وہ لکھے گا کہیں نہیں

دیکھی نہیں ہے جس نے مری پاک سرزمیں
وہ آشنائے عکسِ بہشتِ بریں نہیں

رہتے ہیں اک سرورِ تعلق میں رات دن
یہ کیفِ جاں رہینِ مئے و انگبیں نہیں

دھرتی پہ ایسے آتش و آہن کا راج ہے
جیسے وہ ہر کہیں ہے مگر اک یہیں نہیں

جلیل عالی

غزل

مکالمے کو من و تو کا معرکہ تو نہ کر
کر اختلاف ، دلوں بیچ فاصلہ تو نہ کر

بجا کہ راہ کی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں
مفاہمت کی ضرورت کو فلسفہ تو نہ کر

میانِ ممکن و موجود فرق رہتا ہے
جو ناروا ہے اسے سوچ میں روا تو نہ کر

ہمارے شہر کے دشمن بھی اپنی گھات میں ہیں
سو احتجاج کو شورش کا سلسلہ تو نہ کر

جو دوستی ہے تو پھر دوستی کا مان بھی رکھ
ذرا سی بات کو بابِ مقاطعہ تو نہ کر

یہ مانتے ہیں کہ تو اُس کے اختیار میں ہے
مگر ہے وہ بھی تو انساں ، اُسے خدا تو نہ کر

دُکھا ہوا ہے جو دل اپنے دوستوں سے ترا
تو اِس غبار میں دشمن سے رابطہ تو نہ کر

خلا بھرا نہ ترا خاک میں ملا کے ہمیں
اب اپنی ریزگیِ دل کو قہقہہ تو نہ کر

جلیل عالی

غزل

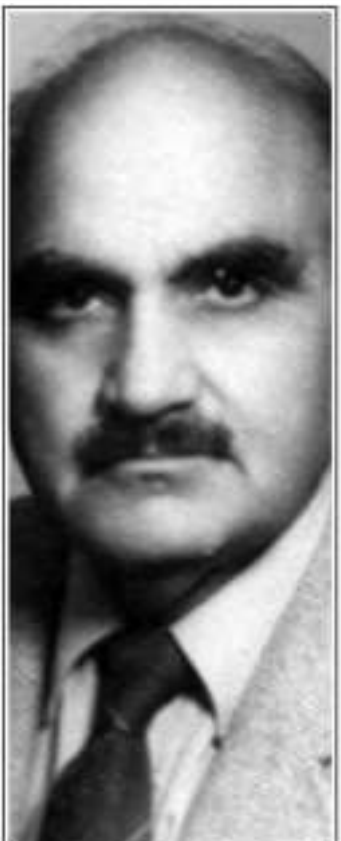

اُس کی رعنائی کا عالم کس سے دیکھا جائے ہے
سُرخیٔ لب سے کوئی شعلہ سا اُٹھتا جائے ہے

اک زمانہ اُس بُتِ طناز کی ٹھوکر میں ہے
کیا خبر کس سمت وہ سیلِ تماشا جائے ہے

ذرہ ذرہ راہ کا، سیرابِ کیف و رنگ ہے
تیری رفتارِ جنوں ساماں کا دریا جائے ہے

بحر کو یہ دُھن کہ ساحل کو بھی بڑھ کر کھینچ لے
موج کا یہ عزم ہے، بیرونِ دریا جائے ہے

شوق، محرومِ تمنا، عشق، محرومِ وصال
کس سے یہ نظمِ کہن دنیا کا بدلا جائے ہے

گردِ ماہ و سال نے دُھندلا دیئے سارے نقوش
دل سے اُس کی یاد کا پرتو بھی مٹتا جائے ہے

جمیل یوسف

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کسی کے روکے سے ہوئی نہیں رُکی خالد
وہ صبح بن کے اُجالوں تک آگیا آخر

غزلیں

دنیا کا محاصرہ کیا ہے
تب اپنا محاسبہ کیا ہے
افسوس یہ ہے کہ اس نے میرا
دنیا سے موازنہ کیا ہے
رد کی ہے کہاں دلیل اس کی
بس دور مغالطہ کیا ہے
خود ہار گیا ہے وقت ہم سے
کب ہم نے مقابلہ کیا ہے
معلوم نہیں ہمیں کہ اس نے
کیا ہم سے معاملہ کیا ہے
کب عشق کیا ہے اس نے مجھ سے
جلدی میں معاہدہ کیا ہے

محسن اسرار

ذرا بھی میں کہیں چوکا تو ٹوٹ جاؤں گا
اسے جو دوسرا سمجھا تو ٹوٹ جاؤں گا
مجھے عجیب سی مہلت نے تھام رکھا ہے
اب ایک لمحہ بھی گزرا تو ٹوٹ جاؤں گا
مجھے یقیں نہ دلا بازیافت ہونے کا
اگر یقیں نہیں آیا تو ٹوٹ جاؤں گا
میں ایک واہمے کی انتہا پہ بیٹھا ہوں
جو میں نے پہلو بھی بدلا تو ٹوٹ جاؤں گا
اُداسیاں مرے اعصاب پر مسلط ہیں
کسی نے قہقہہ مارا تو ٹوٹ جاؤں گا

بے کار الجھ رہی ہو مجھ سے
میں نے کوئی تبصرہ کیا ہے
پائیں گے تجھے نہ کھونے دیں گے
اب ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے
اَن بَن کے سوا بھی اس نے مجھ سے
چپ چاپ مباحثہ کیا ہے
میں اہل نہیں ہوں اس کا محسن
جو اس نے مطالبہ کیا ہے

اب انتظار سے آگے نکل گیا ہے وجود
کوئی قریب سے گزرا تو ٹوٹ جاؤں گا
عجیب کرب سا محسوس ہو رہا ہے مجھے
کسی نے حال بھی پوچھا تو ٹوٹ جاؤں گا
ستا رہا ہے مجھے اب مرا اکیلا پن
رہا کچھ اور اکیلا تو ٹوٹ جاؤں گا
مرے خدا! مری آنکھوں میں نیند آنے دے
میں آج رات نہ سویا تو ٹوٹ جاؤں گا

غزل

اے وطن! دیکھ یہ عالم مری سرشاری کا
حق ادا کر دیا میں نے بھی نمک خواری کا

کوچۂ عشق میں دم سادھے کھڑا تھا میں بھی
مرحلہ ایسا نہ آیا کہیں دشواری کا

خود کلامی تھی مگر غیر سمجھ کر خود کو
کب رہا شوق مجھے ایسی اداکاری کا

سائباں دھوپ کا سورج نے بنایا مجھ پر
آگیا لوٹ کے موسم بھی شجرکاری کا

ہوسِ زر میں تو کچھ اور نہ سوجھا اس کو
کیا کہیں آیا سلیقہ نہ جہاں داری کا

کوئی ایثار کا جذبہ تو ابھر کر آئے
ختم ہو جائے گا یہ عہد بھی ناداری کا

تشنہ لب بچوں نے ہاتھوں میں اٹھائے کوڑے
اس مرقعے سے لیا کام عزاداری کا

میں قبیلے میں معزز تھا اسے یاد رہا
بھولتا کیسے زمانہ مری سرداری کا

ہر طرف سبزہ و گل میں ہی کھلاؤں گا حسنؔ
یہ بھی اک طرح مداوا ہوا بے کاری کا

حسن عسکری کاظمی

غزل

مِٹّی میں اشک گھول کے گارا بناؤں گا
پھر اِس سے اپنا آپ دوبارہ بناؤں گا

تبدیل ہو چکے ہیں سبھی زاویے، سو مَیں
اب ایک اَور قطبی ستارا بناؤں گا

ساری ہَوا کو ایک جگہ جمع کر کے مَیں
بچّے کے کھیلنے کو غبارہ بناؤں گا

ہر چند زندگی سے مجھے کچھ گلے بھی ہیں
اس ناگوار کو بھی گوارا بناؤں گا

تبدیل کر کے مُردہ رسوم و رواج کو
مَیں اِس معاشرے کو دوبارہ بناؤں گا

شامل کروں گا اپنا بدن اور روح بھی
اب کے مجسّمہ جو تمہارا بناؤں گا

جو رنگ دستیاب نہیں ہیں دھنک میں بھی
وہ سب ملا کے رنگ تمہارا بناؤں گا

تعمیرِ نو کروں گا جب اپنے مکان کی
آدھا بنا ہوا تھا جو، سارا بناؤں گا

ساحل کی سمت جانے سے حاصل ہی کچھ نہیں
دریا کے عین بیچ کنارا بناؤں گا

دندانے جس کے جسم میں پیوست ہو سکیں
اِک ایسا تیز دھار سا آرا بناؤں گا

اُس میں بھنور بھی ہو گا مرا ہم سفر نسیمؔ
میں سیر کے لیے جو شکارا بناؤں گا

نسیمِ سحر

غزل

زبانیں چپ رہیں گی سایۂ دیوار بولے گا
سکوت شب ہی انجانی سحر کے بھید کھولے گا

نہیں معلوم قسمت کب ہمیں وہ دن دکھائے گی
امیرِ شہر جب اپنا گریباں خود ٹٹولے گا

یقیں آتا نہیں مسلم کا مسلم ہی عدو ہوگا
عدو ایسا جو خود کو خونِ ناحق میں ڈبولے گا

شکاری ہر پرندے کو ہی رزق تیر کہتا ہے
جو زد میں آئے گا اُڑنے کو اپنے پر بھی تولے گا

جنھیں رغبت ہو طوفاں سے وہ دریا پار جائیں گے
وہ ڈوبیں گے سرِ ساحل سفینہ جن کا ڈولے گا

عجب انداز سے بچھڑا تھا کل جو پھیر کر آنکھیں
گماں تھا چھوڑ کر سب کو وہ میرے ساتھ ہولے گا

بھلا پیتے ہوئے امرت وفا کا کب یہ سوچا تھا
مقدر ہی مرا زہرِ ہلاہل اس میں گھولے گا

مقیّد ہے وہ گو قصرِ اَنا میں، چھوڑ کر مجھ کو
ہوا یادوں کی آئے گی دریچے جب بھی کھولے گا

کسے معلوم تھا اک آفریں نادان دیوانہ
زمانے بھر کا سب دکھ درد سینے میں سمولے گا

رشید آفرین

غزل

ستم کی زد میں ہر اک روزگار دیکھا ہے
یہ حرفِ صدق مگر پائیدار دیکھا ہے

سمندِ شوق ترا ہر قدم مبارک ہے
کہ جب بھی دیکھا تجھے شہسوار دیکھا ہے

کوئی تو جا کے تغافل شعار سے کہہ دے
خموش آنسوؤں کو شعلہ بار دیکھا ہے

خیالِ یار کی سرشاریاں میسر ہیں
نفس نفس میں انھیں مشکبار دیکھا ہے

سکون بانٹتا ہے بے غرض جو راہی کو
اسی شجر کو سدا سایہ دار دیکھا ہے

یہ سب ہوائے محبت کا فیض ہے جو ریاض
فریب کھا کے بھی دل پُر بہار دیکھا ہے

سید ریاض حسین زیدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک گام سرِ راہِ سپاس آئی نہ دنیا
دریوزۂ عقبیٰ تھا ، سو ، راس آئی نہ دنیا

غزل

ہیں لمحے لمحے کو ازبر نصاب یادوں کے
میں بھولتا ہی کہاں ہوں حساب یادوں کے

جہاں سے گزرا تھا وہ قافلہ بہاروں کا
وہاں پہ بکھرے ہیں اب بھی گلاب یادوں کے

ہماری آنکھوں میں رہتا ہے ایک ہی موسم
برستے رہتے ہیں ہر دم سحاب یادوں کے

گئی رتوں کا مرے چاروں اور میلہ ہے
اُلٹ دیئے ہیں یہ کس نے نقاب یادوں کے

وہ جاتے جاتے مجھے یہ پیام دے کے گیا
ہمیشہ رکھنا ان آنکھوں میں خواب یادوں کے

ہمارا رابطہ رہتا ہے مستقل ان سے
جبھی تو وا سدا رہتے ہیں باب یادوں کے

اُترتے رہتے ہیں دل پر جلیل ہر لحظہ
صحیفے درد کے بن کر عذاب یادوں کے

احمد جلیل

غزلیں

نئے سفر کی طرف ہے رواں حیات ابھی
نہ جانے کتنے ہیں درپیش ممکنات ابھی
اگرچہ ان سے میں بچ بچ کے چل رہا ہوں مگر
لگے ہوئے ہیں تعاقب میں، حادثات ابھی
ہر اک نتیجۂ تحقیق سے یہ علم ہوا
کہ ابتدا میں ہے تسخیر کائنات ابھی
مسافروں کو نپٹنا ہے ان لٹیروں سے
جو رہ میں بیٹھے ہوئے ہیں لگا کے گھات ابھی
جب آیا وقت تو مجھ کو، مجھی دعا دو گے
لگے گی زہر ہی میری ہر ایک بات ابھی

سید قاسم جلال

بنیں گے مرکزِ اہلِ نگاہ اب کوئی اور
مری نظر نہیں سوئے کراچی و لاہور

ہیں کامیاب وہی، جو حصولِ علم کے بعد
عمل کے واسطے تیار ہو گئے، فی الفور

تری نگاہ پہ اسرار فاش ہوں کیسے
کیا ہے تُو نے کبھی ذات و کائنات پہ غور؟

فغاں کہ کل جو مسلماں تھے رہبرِ عالم
وہ اب نشانِ تباہی ہیں اور نشانۂ جور

دیا تھا درس تو ''لاتفرقو'' کا آقا نے
مگر یہ تم میں ہے کیوں فرقِ نسل و ذات ابھی
کرو نہ فکر کہ صبحِ طرب کا ہے آغاز
محیط دل پہ ہے، غم کی سیاہ رات ابھی
نژادِ نو کو بھی خود اعتماد، ہونے دیں
بیاں کریں نہ حضور! اپنے تجربات ابھی
نہ رو جلال کہ تجھ کو خبر نہیں کہ ترے
ہیں انتظار میں کتنے ہی سانحات ابھی

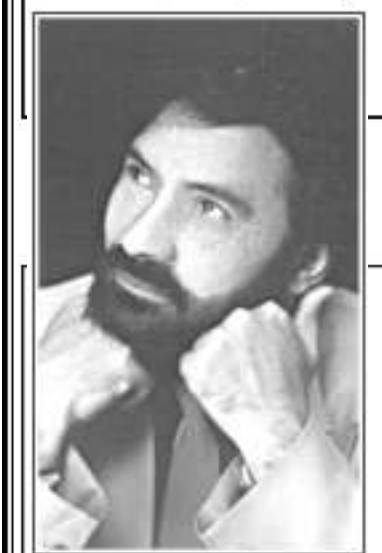

ہے کون؟ ملّتِ اسلام کے جو پونچھے اشک
ہے منتظر نئے اقبال کا، ہمارا دور

جلال آج مسلماں سبھی، یہ سوچیں ہم
رہا ہوں فتنۂ مغرب کے جال سے کس طور

غزل

ہر پیڑ سائباں نظر آیا ہے دھوپ میں
قدرت نے شامیانہ لگایا ہے دھوپ میں

شاکی ملیں گے خواہ شجر خود ہی کاٹ دیں
جن کو بھی زندگی نے پھرایا ہے دھوپ میں

فطرت ہے مہرباں کبھی ایسا نہیں ہوا
اپنوں کے سر پہ چھاؤں، پرایا ہے دھوپ میں

دیوار آ گئی کوئی سورج کے سامنے
دنیا سمجھ رہی ہے کہ سایہ ہے دھوپ میں

ساون کی بارشوں سے فضا سبز ہو گئی
ہریالیوں نے سبزا بچھایا ہے دھوپ میں

ڈر ہے کہ رنگ روپ کو گرمی جھلس نہ دے
شدت سے ڈھنگ آگ کا آیا ہے دھوپ میں

لگتا ہے اس کے رخ کی چمک چوند دیکھ کر
جیسے کسی نے حسن ملایا ہے دھوپ میں

گلزار بادلوں میں دھنک ہے بنی ہوئی
رنگوں نے کیا جمال دکھایا ہے دھوپ میں

گلزار بخاری

غزل

لازم کہیں نہیں رخِ قبلہ درست ہو
اتنا ہے صرف نیّتِ سجدہ درست ہو

مل بیٹھ کر جہاں نہیں رہتے گھروں کے لوگ
لگتا نہیں کہ شہر کا نقشہ درست ہو

باقی دنوں میں تجربۂ عاشقی کے بعد
وہ کچھ کروں گا جس کا نتیجہ درست ہو

بے شک وہ لکھنؤ سے نہ دہلی سے ہو مگر
شیریں زبان ہو لب و لہجہ درست ہو

جو کچھ کسی کے سامنے کہنا محال ہے
ایسا نہیں کہ وہ پسِ پردہ درست ہو

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچی نیند میں ہیں اندیشے
انجانے میں جاگ نہ جائیں

غزل

پہلے تو پختہ کیا خام خیالی نے مجھے
پھر زرِ عشق دیا دامنِ خالی نے مجھے

میزبان اور بھی ہیں شہر میں میرے لیکن
باندھ رکھا ہے تری خیر سگالی نے مجھے

ورنہ کب اتنی بلندی پہ پہنچ سکتا تھا
محوِ پرواز رکھا بے پر و بالی نے مجھے

سوچتا ہوں کہ کتابوں میں رکھوں یا دل میں
پھول بھیجا ہے کسی چاہنے والی نے مجھے

منتظر مشرق و مغرب ہیں ابھی تک میرے
کھینچ رکھا ہے جنوبی نے شمالی نے مجھے

میں نے بھی اس پہ سوالات کی بارش کر دی
جب پریشان کیا ایک سوالی نے مجھے

اب کوئی سرخ سویرا ہی بچا سکتا ہے
مار ڈالا ہے مری سبز خصالی نے مجھے

ساغرِ جم کی ضرورت ہی نہیں ہے باقیؔ
ہر خبر دی ہے مرے جامِ سفالی نے مجھے

باقی احمد پوری

غزلیں

کبھی نیندیں تو کبھی خواب پرونے میں گئی
زندگی اپنی تو سامان ہی ڈھونے میں گئی

دُکھ ہی دُکھ تھے تو مرے نام تھی یہ دل کی زمیں
گئی تو چین کی اِک فصل ہی بونے میں گئی

میر جیسی کوئی تصویر نہیں بن پائی
دن کٹا ہجر میں، شب ساری ہی رونے میں گئی

بحث کرتے رہے خُود سے کبھی اُس سے، آخر
عمر کی پونجی اِسی ہونے نہ ہونے میں گئی

تم بھی کچھ دیر کو آرام کرو اَب خاورؔ
سو گئی چاندنی اور رات بچھونے میں گئی

خاور اعجاز

اچھے ہمدرد ہو اپنوں کا بُرا چاہتے ہو
شہر یارو! کہو ہم لوگوں سے کیا چاہتے ہو
کیسے دِلبر ہو کہ ہر موسمِ دلداری میں
ہم فقیروں سے ہی پیمانِ وفا چاہتے ہو
صحنِ کعبہ میں بھی بیٹھے ہو تو منہ پھیرے ہُوئے
اِس تعرض پہ بھی تائیدِ خُدا چاہتے ہو
بادِ مشرق ہی بچی ہے نہ کوئی بادِ شمال
سانس لینے کے لیے کتنی ہَوا چاہتے ہو
میری مٹھی میں مری مٹی بھی باقی نہ رہی
اور کیا مجھ سے مرے قبلہ نما چاہتے ہو

آگ لگ جائے گی اِس خیمۂ عافیت میں
روشنی کے لیے تم جیسا دیا چاہتے ہو
کیسے چالاک ہو، بوسے کی طلب ہے اُس سے
اور کہتے ہو کہ خشکی کی دوا چاہتے ہو
اُڑتے پھرتے ہو کسی اور ہَوا میں خاورؔ
ایسا لگتا ہے کہ اَب تم بھی گِرا چاہتے ہو

غزل

دیا بھی نام کا اُن کے جلا دیا گیا ہے
وہ جن کو بجھنے سے پہلے بجھا دیا گیا ہے

کہ سرخ رو نہ ہوئی زندگی کبھی جن سے
اُنھی کے پیچھے زمانہ لگا دیا گیا ہے

قیامِ صبح تلک ہی تری ضرورت تھی
یہ کہہ کے جانے کا رستہ دکھا دیا گیا ہے

وہاں اندھیروں سے الجھا رہا دھواں تا دیر
جہاں کہیں بھی دیوں کو بجھا دیا گیا ہے

ہوا کی تیغ پہ رقصاں دیے کی لو کی قسم
نشانِ زندگی جس کو بنا دیا گیا ہے

-----ق-----

کہ جی رہے ہیں مقدر کی تاب لاتے ہوئے
ستارہ سا ہمیں جس جا، سجا دیا گیا ہے

ہمی سے رونقِ دنیا، ہمی سے بزمِ عدم
سجا ہے اپنی جہاں بھی بٹھا دیا گیا ہے

جلائے دیتی ہے ہم کو یہ زندگی کی لو
چراغِ جاں تہِ داماں ہوا دیا گیا ہے

تھا حرف حرف ہی دامن کشاں پہ مصرعہِ جاں
جہاں بھی بس میں ہوا ہے سنا دیا گیا ہے

طارق بٹ

غزلیں

میں جب کسی چراغ کی لو سے لپٹ گیا
آئینہ اپنی آنکھ کے اندر سمٹ گیا

پیدا ہوئی عروج سے صورت زوال کی
سورج جواں ہوا تو مرا سایہ گھٹ گیا

آیا ہوں خاک چھان کے میں دشتِ نجد کی
یہ کام میرے ہاتھ سے کیسے نمٹ گیا

کیا ختم ہو گئی گُلِ موعود کی کشش
کیا میری طرح شہر بھی ٹکڑوں میں بٹ گیا

آئی ہوا تو محو ہوئے رنگ باغ کے
مٹی اُڑی تو گرد میں ہر پھول اٹ گیا

سچ بولنے کا کوئی ارادہ نہ تھا مگر
جب سر پہ آ پڑی تو یہ ناچیز ڈٹ گیا

ساجد کوئی قضا کے مقابل نہ آ سکا
جو کارواں لپیٹ میں آیا وہ کٹ گیا

غلام حسین ساجد

صاحبِ شام نے جب شروعات کی سیرِ آفاق کی
میں نے بھی لو بڑھا دی ذرا دیر کو اپنے اوطاق کی

لاکھ چاہا کہ اُس سے کنارہ کروں پر نہیں ہو سکا
گفتگو اُس پری وش نے میری طبیعت کے مصداق کی

طاقچے پر کتاب صداقت دھری کی دھری رہ گئی
اب سیاہی بھی تحلیل ہونے لگی بوسیدہ اوراق کی

جس طرف دیکھیے آگ کا کھیل جاری ہے افلاک پر
اب ضرورت نہیں ہے مرے مہربانوں کو چمقاق کی

اپنے ورثے میں جو کچھ ملا تھا مجھے میں نے باقی رکھا
قرض تھی جو محبت مری نسل پر میں نے بے باق کی

پاؤں دھرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی قریۂ نجد میں
یعنی تکریم ہے میرے دل میں بہت کارِ عُشاق کی

طاقِ نسیاں پہ ساجد دھری رہ گئی فصلِ آسودگی
گُھٹ گئی پھر جہالت کے سیلاب میں روحِ میثاق کی

غزل

کچھ نہ کچھ ہے کہیں پسِ دیوار، یوں ہی سر پھوڑتا نہیں ہوں میں
اک تعلق ہے رائگانی سے، اور اسے توڑتا نہیں ہوں میں

عشق ہے یا ہے خوفِ رسوائی، بات اب تک سمجھ نہیں آئی
بے خیالی میں ہاتھ پکڑا تھا، اب اسے چھوڑتا نہیں ہوں میں

حسنِ تدبیر! کارِ زیبائی!، اُس کی تصویر بن نہیں پائی
کینوس پر لگے ہوئے نقطے، ٹھیک سے جوڑتا نہیں ہوں میں

کارِ آتش مدام جلنا ہے، اِک سفر عمر بھر کا چلنا ہے
منزلیں چھوڑ دیں خوشی سے مگر، راستہ چھوڑتا نہیں ہوں میں

خود کو مشکل پسند رکھتا ہوں، اپنی مٹھی میں بند رکھتا ہوں
جس طرف کچھ نہیں ہے 'لا حاصل'، اس طرف موڑتا نہیں ہوں میں

رنگ و خوشبو لُٹایا کرتے ہیں، پھر یہ مرجھا بھی جایا کرتے ہیں
پیار پھولوں سے اسقدر ہے مجھے، شاخ سے توڑتا نہیں ہوں میں

نرم لہجے میں بات کرتا ہوں، پیار سے روکتا ہوں ٹوکتا ہوں
دل تو نازک سا ایک بچہ ہے ،اس کو جھنجھوڑتا نہیں ہوں میں

تم سناتے ہو پیار کے قصے، رنگ بھرتے ہو اپنی باتوں میں
عشق پالا ہے سات پردوں میں، اس کو ڈھنڈورتا نہیں ہوں میں

اس کے پیچھے بھی چل کے دیکھ لیا، دور آگے نکل کے دیکھ لیا
وقت ناراض ہے کنور مجھ سے، تیز تر دوڑتا نہیں ہوں میں

اعجاز کنور راجہ

غزل

ہو چکا آخری اعلان، مجھے جانا ہے
راستہ دے دو مری جان! مجھے جانا ہے

میں نے ہر بات دل و جان سے مانی اس کی
یہ بھی تو اس کا ہے فرمان، مجھے جانا ہے

آخری حکم ہے، تعمیل تو کرنی ہو گی
چاہے جیسا بھی ہو نقصان، مجھے جانا ہے

وقت کم ہے، سو تمہیں صاف کہے دیتا ہوں
اب نہ کرنا کوئی احسان ، مجھے جانا ہے

راستہ شہرِ خموشاں کا دکھا دو کہ وہاں
کچھ دنوں بعد بصد شان مجھے جانا ہے

آئنہ خانوں میں جا کر یہ بتا آیا ہوں
اب نہ تم ہونا پریشان ، مجھے جانا ہے

ایک اک دوست سے مل کر یہ بتانا ہے مجھے
میں ہوں کچھ روز کا مہمان، مجھے جانا ہے

دفن کر آیا ہوں سب خواب کسی آنگن میں
اب حسنؔ بے سر و سامان مجھے جانا ہے

حسن عباس رضا

غزلیں

نہ خود بہکا نہ بہکایا گیا ہوں
میں کتنا لطف فرمایا گیا ہوں

نہ پگڈنڈی نہ چھاؤں برگدوں کی
کہاں سے میں کہاں لایا گیا ہوں

سو مطلب جانتا ہوں بے بسی کا
میں کتنی دیر تڑپایا گیا ہوں

بہر صورت خلا باقی رہے گا
بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

مکینِ شہرِ ناپرساں ہوں، لیکن
درونِ شہر دفنایا گیا ہوں

وہاں میرا نہ ہونا ہی بھلا تھا
جہاں پرواز میں پایا گیا ہوں

یعقوب پرواز

پرائی چال چلنے کے سوا کچھ بھی نہ ہاتھ آیا
کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ بھی نہ ہاتھ آیا

کوئی پہچان ہی باقی نہیں اُس کی زمانے میں
اُسے چہرے بدلنے کے سوا کچھ بھی نہ ہاتھ آیا

گہر ہائے گرانمایہ سے یوں ہی ہاتھ دھو بیٹھا
سمندر کو اچھلنے کے سوا کچھ بھی نہ ہاتھ آیا

اُسے جو بھی ملا، اُس کی توقع سے زیادہ تھا
مگر ہم کو بہلنے کے سوا کچھ بھی نہ ہاتھ آیا

ہمیں اس قافلے کی گرد سے بھی بچ کے چلنا ہے
جسے پرواز جلنے کے سوا کچھ بھی نہ ہاتھ آیا

غزل

سہا ہوں کسی خواب کی وحشت سے نکل کر
حیران ہوا جاتا ہوں حیرت سے نکل کر

دانستہ بھلاتا ہی نہیں میں غمِ فرقت
تکلیف میں رہتا ہوں اذیت سے نکل کر

ہے درد! ترے ساتھ رہ و رسم پرانی
بے کل سا ہوا دل تری شدت سے نکل کر

میں سرحد ادراک پہ دیوار اٹھاتا
اس عالمِ امکان کی وسعت سے نکل کر

اک چیخ کی لرزش تھی کہیں آبِ رواں میں
ڈوبا ہے یہاں کون عقوبت سے نکل کر

خوابیدہ ستاروں نے شبِ تار سجائی
اک گریہ کناں چشمِ بصیرت سے نکل کر

میں عالمِ موجود کو نابود نہ کردوں
اس حشر بپا شورِ قیامت سے نکل کر

کیا کچھ ہے بھلا حسن کی دیوار کے اس پار
دیکھا ہی نہیں شہرِ محبت سے نکل کر

ہے کون ترے دستِ دعا میں یہ دعا سا
لپکا جو ہے اس خانہء الفت سے نکل کر

علی اصغر عباس

غزلیں

اپنے باطن کو یوں سنوارا کر
دل میں اس شوخ کو اتارا کر

چند لمحے کبھی تو خلوت میں
کٹ کے ماحول سے گزارا کر

سیکڑوں لوگ دیکھتے ہیں تجھے
کبھی اپنی نظر اتارا کر

پھونک وہم و گمان کی دنیا
اپنی دانست کو شرارا کر

بات جب بھی چلے محبت کی
پھر نہ تکلیفِ استخارا کر

منظور ثاقب

بیر کی آگ میں جل بھن کے وہ مر جائے گا
دوستی کے نہ جو دریا میں اتر جائے گا

چھوڑ دوں خواب تو پھر زیست سفر چہ معنی
ساتھ میرے یہ مرا زادِ سفر جائے گا

آج بھی کل کی طرح جس کو نہ مزدوری ملی
سوچتا میں ہوں کہ کس منہ سے وہ گھر جائے گا

کتنے فرقوں میں گروہوں میں بٹا ہے انساں
بٹتے بٹتے وہ خدا جانے کدھر جائے گا

شہرِ نفرت سے وہ اک روز کرے گا ہجرت
اور سب خواب لیے پریم نگر جائے گا

زندگی لیتی ہے سانس اس کی بدولت ثاقب
کوئی خواہش بھی نہ رکھے گا تو مر جائے گا

غزلیں

شاعروں میں جو نام ہے اُس کا
ذہن و دل میں اُسی کا ڈیرہ ہے
کچھ تو اعلیٰ کلام ہے اُس کا
دھڑکنوں میں قیام ہے اس کا

ہر جگہ اُس نے پائی ہے عزت
وہ مہک ہی مہک ہے سر تا پا
ہر کہیں احترام ہے اُس کا
گلستانوں میں کام ہے اُس کا

لوگ ملتے ہیں اُس سے جُھک جُھک کر
وہ زمیں زاد ہے مگر راشد
ایسا اونچا مقام ہے اُس کا
آسماں پر مقام اُس کا

ہم سبھی کے لیے نمونہ ہے
کام جو صبح و شام ہے اس کا

ممتاز راشد لاہوری

ٹیکسوں کی بھرمار کے ہاتھوں
خوار ہوئے سرکار کے ہاتھوں

طُرفہ تماشا ہی کہہ لیجے
جسم بھی لاغر لاغر ٹھہرا
نفرت جھیلی پیار کے ہاتھوں
روحانی آزار کے ہاتھوں

ہم ملبے میں ڈھل جائیں گے
پَل پَل زخمی ہوتے ہیں ہم
اک گِرتی دیوار کے ہاتھوں
نینوں کی تلوار کے ہاتھوں

حیرت کی تصویر بنے ہیں
کیا دل سوز خبر ہے راشد
پیکرِ پُراسرار کے ہاتھوں
یار مرا ہے یار کے ہاتھوں

غزل

شُکر ہے عقل کو بہلانے میں تم چھوڑ گئے تھے
یعنی کچھ ہوش تو دیوانے میں تم چھوڑ گئے تھے

میرے یوں ہونے پہ حیراں ہو، سمجھ سکتا ہوں
میرا کردار تو افسانے میں تم چھوڑ گئے تھے

خوش ہوں اِس بار بہت سوچ سمجھ کر مجھے چھوڑا
یاد ہے؟ پہلے تو اَن جانے میں تم چھوڑ گئے تھے

اک وہی بات سمجھ آئی مجھے، یارِ طرح دار!
اک وہی بات کہ سمجھانے میں تم چھوڑ گئے تھے

شوق سے آؤ مرے شہر میں ٹھہرو، حامدؔ!
میں وہی ہوں جسے ویرانے میں تم چھوڑ گئے تھے

حامد یزدانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اپنی جوت جگانا خالد اپنے الاؤ بنانا
اپنے عشق میں میرے جیسا اپنا حال نہ کرنا

غزل

تا کوئی سن نہ سکے منت و زاری اُس کی
میں نے آنے ہی نہیں دی کبھی باری اُس کی

داؤ جب آنکھ کا لگتا ہے اُلٹ کر پتے
بازیاں ہار کے اٹھتے ہیں جواری اُس کی

پھول جھڑتے تو کبھی گرتے ستارے موتی
گفتگو بڑھ کے تھی ہونٹوں سے بھی پیاری اُس کی

بات کی اور نہ وہ بہتی ہوئی آنکھیں دیکھیں
ان سنی کر کے سنی گریہ و زاری اُس کی

رات جو آگ مرے دل میں لگی صبح کے وقت
عرش پر دیکھ ذرا کارگزاری اُس کی

یاد کا کیل نکالا نہ گیا جب میں نے
دل کی دیوار سے تصویر اتاری اُس کی

لازماً کچھ تو دکھایا ہے کہ بیعت کے لیے
چومتے پھرتے ہیں پاپوش مداری اُس کی

چھین کر اور کوئی چلتا بنا وجہِ فساد
ہم رہے سوچتے آپس میں ہماری اُس کی

خون کے داغ بھی بن جائیں گے عظمت کے نشاں
یاد کی جائے گی ہر نقش نگاری اُس کی

لاٹری روز نکلتی ہے کسی اور کے نام
میری آتی ہے کبھی اور نہ باری اُس کی

عشق تو کچھ بھی نہیں جل کے یہ معلوم ہوا
یوں ہی دل پر مرے وحشت رہی طاری اُس کی

اب تو ہر شخص کم و بیش اسی خوف میں ہے
کھل نہ جائے کہیں رستے میں پٹاری اُس کی

جو چلاتی تھی مقدر کے ستارے میرے
اَڑ گئی مجھ کو تو لگتا ہے غراری اُس کی

پیڑ سے لکڑی بنا ڈالا ہے جس نے راحت
زنگ کی موت مرے گی کبھی آری اس کی

راحت سرحدی

غزل

مٹی کا اک غبار جو سوئے فلک گیا
اک بار تو خود اپنی طرف میرا شک گیا

سایہ ہے اس پہ وصل کی خواہش کے خوف کا
لیکن اگر کہیں کوئی غنچہ چٹک گیا

چاروں طرف سے خون کے چشمے ابل پڑے
سایہ مرے وجود کے اندر سرک گیا

میری بھی تھوڑی حوصلہ افزائی ہو گئی
جاتے ہوئے وہ میرا بھی شانہ تھپک گیا

میری کشش میں کوئی کجی تو ضرور ہے
جو بھی مرے حصار میں آیا ، بھٹک گیا

احمد میں پہلے عشق کو ، سمجھا تھا آخری
یہ سلسلہ چلا تو بہت دور تک گیا

احمد حسین مجاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک بے خبری مایۂ اربابِ خبر تھی
یہ بات کھلی ، حیرتِ اربابِ نظر سے

غزل

واجد امیر

نہ دوریوں کی خجالت نہ قربتوں میں قریب
پڑا ہُوا ہے یونہی دل میں دشتِ بے ترتیب

یونہی رہے گی سدا کشمکش تو یوں ہی سہی
ہَوا کا اپنا مقدر ، دیے کا اپنا نصیب

عجیب صحن ہے بارش نہ دھوپ کچھ بھی نہیں
نہ دن، نہ رات، وہی جھٹ پٹے کے سائے مہیب

نہ کچھ بُرائی مکمل ، نہ خیر میں کامل
ہوئی خراب کہاں خیر و شَر کی یہ ترتیب

سُنانے والا کوئی اور نہ سُننے والا کوئی
ہم آپ اپنے مخاطب، ہم آپ اپنے خطیب

پڑا تھا نسلوں میں رخنہ جو حملہ آوروں کا
ملی تھی ورثے میں یوں بھی لُٹی پٹی تہذیب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دستِ غم نے دلِ دریا میں اتارا کس کو
دائرہ بن کے سرِ سطح اُبھر کون آیا

غزل

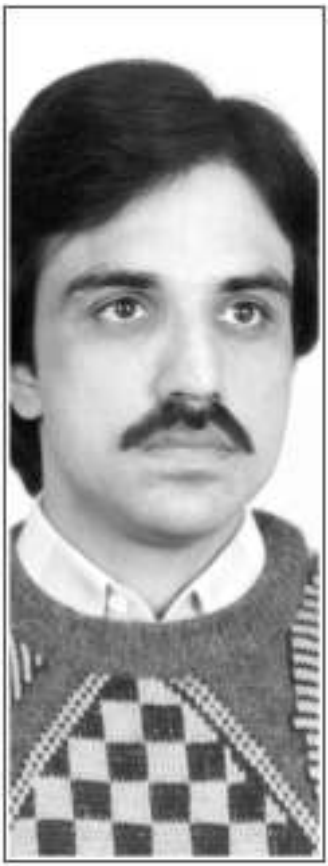

جو آ گہی ہو تو پھر کچھ پہیلیاں بھی رہیں
دلہن کے گرد، دلہن کی سہیلیاں بھی رہیں

سوادِ فکر میں تعمیر ہوں نئے امکاں
درونِ شہر پرانی حویلیاں بھی رہیں

بچھی رہے مرے آنگن میں دھوپ سی چھاؤں
کپاس جیسی چمکتی چنبیلیاں بھی رہیں

حیا کی ضو سے دمکتے رہیں ترے رخسار
حنا کی لو سے دہکتی ہتھیلیاں بھی رہیں

رہے یہ سیم و زرِ مہر و مہ بھی کاسے میں
فلک کی جیب میں تاروں کی دھیلیاں بھی رہیں

طلوعِ صبح کا ہو انتظار بھی جمشید
شبِ ستم کی جبیں پر تریلیاں بھی رہیں

جمشید چشتی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رنگِ رَم و رفتارِ زمانہ نہیں بھولے
دیکھا نہ قدم بھر کے تری چال سے آگے

غزل

دن کھا گئے شب سرا ہماری
گھر واپسی ہے یہ کیا ہماری

گزرا بھی نہیں قریب سے وہ
مٹی بھی اُڑا گیا ہماری

اے کوہِ وجود پھر سے اک بار
آواز نکالنا ہماری

ہر کوچ ہمارا کوچ نکلا
زندہ رہے خاک پا ہماری

ہم کیسے برہنہ تھے، کہاں تھے
رکھی ہی رہی قبا ہماری

ہم بولنے بھی لگیں گے اک دن
تم سنتے رہو صدا ہماری

جیسے کہ شروع عشق اچانک
کچھ ایسی تھی ابتدا ہماری

تم روشنی کرکے جا چکے تھے
تربت کوئی دیکھتا ہماری

شاہین عباس

غزل

دیکھ کے ہر سو خونی منظر میری تو پتھرائی آنکھ
اس کے پس منظر میں جھانکو کس کس کی گہنائی آنکھ

بینا، ہی نابینا ہوں جب پھر منزل پر پہنچے کون
زرداروں کی دیکھ کے حالت میری تو شرمائی آنکھ

دیکھا ہے فقدان حیا کا جب سے خونی رشتوں میں
یکسر ہی گرداب کی صورت پھر میری چکرائی آنکھ

جانے کس گردش نے اس کو حال سے ہے بے حال کیا
دیکھ کے اس کا اترا چہرہ میری تو بھر آئی آنکھ

اس کے سوا تو اپنے پاس بھی اور ذریعہ کوئی نہ تھا
صبر و شکر کے جلووں سے بس ہم نے تو بہلائی آنکھ

اس کے دل میں کب ایمان کی دولت گھر کر سکتی ہے
دیکھ کے سیم و زر کی کرنیں جس کی بھی للچائی آنکھ

داد نہ دوں اقبال سروبہ کیوں نہ اس باعظمت کو
اہل شر میں رہ کر جس نے اپنی آپ بچائی آنکھ

اقبال سروبہ

غزل

سورج کا عکس چھاؤں کی جانب نہ ہو سکا
ہم سے سفر میں ایسا مناسب نہ ہو سکا

کل رات ابرِ غم کے حوالے نہ مِل سکے
کل رات بھی شُمارِ کواکب نہ ہو سکا

راسخ تھا اِس طرح تُو مِرے لاشعور میں
دشمن مِرے شعور پہ غالب نہ ہو سکا

لُوٹی ہیں اُس نے پھول سے چہروں کی رونقیں
اُس جیسا کوئی وقت کا غاصب نہ ہو سکا

آصف میں ڈٹ گیا تھا مقابل کے سامنے
پھر بھی ستم کی سمت وہ راغب نہ ہو سکا

شفیق آصف

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بُھولے بسرے جھونکے خالد
کِن یادوں کی دُھول اڑائیں

غزل

جب بھی تتلی نے کسی پھول پہ پَر چھوڑ دیا
اشک بے کل نے مری آنکھ کا گھر چھوڑ دیا

درد و احساس بھی لشکر ہے کہ جس نے، اکثر
کر کے دل زار مرا زیر و زبر چھوڑ دیا

خود کو پتوں میں چھپاتے ہیں وہ پنچھی، جن کو
آگ جنگل میں لگی کاٹ کے پر چھوڑ دیا

میرے یاروں کی طرح تیز ہوا میں دیکھو
خشک پتوں نے ثمر بار شجر چھوڑ دیا

ضعفِ بازو نہ سمجھ اور محبت پہچان
تیغ نفرت کی بھی چھوڑی تھی تبر چھوڑ دیا

دل وہ بچہ ہے جسے میلے میں لایا، کوئی
اور تنہا بھی کیا ، فرد و بشر چھوڑ دیا

میں نے ہر سانس بنالی ہے یہ ناؤ، کہ تو نے
موج در موج مسافت میں بھنور چھوڑ دیا

اکرم کنجاہی

غزل

حصارِ وقت میں آتا نہ تھا خیال ترا
یہی تھا عیب ترا اور یہی کمال ترا

میانِ چشم کئی راستے بنانے لگا
پسِ حجاب دمکتا ہوا جمال ترا

یہ مت سمجھ کہ مجھے کچھ خبر نہیں تیری
فقیر پوچھتا رہتا ہے سب سے حال ترا

صدا یہ آئی کہ نظارگی کی تاب نہیں
جن آئنے کے مقابل ہوا جمال ترا

کنارِ ہجر کھڑا تھا ریاضؔ اور اُسے
بلا رہا تھا اُدھر موجۂ وصال ترا

ریاض رومانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیا خبر گاؤں کا ہر گھر ترے گھر جیسا ہو
یہی باتیں کبھی چوپال میں کر دیکھیں گے

غزل

محرمِ ہست و بود کیا
ہر رہ کو مسدود کیا

حاضر ہونا چاہتے تھے
اُس نے لا موجود کیا

کس کی اجازت سے تو نے
میرے زیاں کو سُود کیا

پہلے خلق کیا مقصد
پھر خود کو مقصود کیا

رستہ آگے جاتا تھا
ہم نے ہی محدود کیا

ایک آوارہ نظر نے سحرؔ
شاہد کو مشہود کیا

حسنین سحرؔ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خواب میں خواب کی تعبیر بتا دے مجھ کو
اے مرے آج! مرے کل کا پتا دے مجھ کو

غزلیں

برگ و ثمر بحال نہیں کر سکی ہوا
زخموں کا اندمال نہیں کر سکی ہوا

کرتی رہی جنوب میں نم پاشیاں مگر
ہم قسمتِ شمال نہیں کر سکی ہوا

اونچی حویلیوں کے وہ چشم و چراغ تھے
بھڑکے تو قیل و قال نہیں کر سکی ہوا

جنگل کی آگ بستیوں تک پھیلتی گئی
کم غیظ و اشتعال نہیں کر سکی ہوا

اس بار برف کم تھی سو دریائے ہجر کو
آسودۂ ملال نہیں کر سکی ہوا

تھی زیرِ جبر اس لیے یکساں چہار سو
خوشبو سے مالا مال نہیں کر سکی ہوا

شہپر تھے جن کے ان کی معاون رہی شہاب
بے باز و باکمال نہیں کر سکی ہوا

شہاب صفدر

نہیں جو حصۂ بازار کون دیکھتا ہے
نمائشِ پسِ دیوار کون دیکھتا ہے

ہر آنکھ دیکھ رہی ہے طلوع کا منظر
بجھے دیے! ترا ایثار کون دیکھتا ہے

تلاشِ نان و نمک میں ہے خلق سرگرداں
کتابِ حکمت و اَسرار کون دیکھتا ہے

سبھی کو فکر ہے ڈھلوان پر سنبھلنے کی
سہارا کس کو ہے درکار کون دیکھتا ہے

ستارے کھیلتے ہیں کھیل رات بھر کیسا
بجز، قبیلۂ بیدار، کون دیکھتا ہے

ہے اُس طرف کی چمک جاذبِ نظر از حد
پلٹ کے دھند کے اِس پار کون دیکھتا ہے

شہاب رنگِ طرب سے غرض ہے دنیا کو
دلوں کے ٹوٹے ہوئے تار کون دیکھتا ہے

غزل

دل و نظر میں شجر ہیں، گل و ثمر ہیں مرے
چلا ہوں گھر سے تو کچھ خواب ہم سفر ہیں مرے

ہوائے شہر سے مل کر وہ بھول بھال گیا
کہ منتظر کسی گاؤں میں بام و در ہیں مرے

بدن جلاتی چلی جا رہی ہے دھوپ مرا
اور اُس پہ ظلم کہ بادل بھی بے خبر ہیں مرے

ہوا چلی تو یہ اُڑتے پھریں گے شہر بہ شہر
چمن میں بکھرے ہوئے جو شکستہ پر ہیں مرے

زمیں کا بوجھ سمجھ کر گرا نہیں دینا
کہ چھاؤں بانٹنے والے بھی کچھ شجر ہیں مرے

ہوئے ہیں کون سے تعبیر اور کون سے نئیں
درونِ باغ تو سب خواب اِدھر اُدھر ہیں مرے

پھر ایک شہرِ شفق کا سفر ہوا درپیش
اور اُس میں چاند ستارے بھی ہم سفر ہیں مرے

خورشید ربانی

غزل

دل میں آنے کی ترے آس لگی رہتی ہے
آنکھ کے طاق میں اِک شمع جلی رہتی ہے

اُس کا دامن بھی مرادوں سے نہ ہوگا خالی
میری جھولی بھی دعاؤں سے بھری رہتی ہے

روز آتی ہے مجھے خواب میں ملنے کے لیے
یاد کی جھیل کے اُس پار پری رہتی ہے

غم کی پرچھائیں کبھی چھو کے نہ گزرے تم کو
اس لیے بھی مرے چہرے پہ ہنسی رہتی ہے

درد جتنا بھی ہو ظاہر نہیں ہونے دیتا
چوٹ جیسی بھی ہو چہرے پہ ہنسی رہتی ہے

ساتھ رکھتا ہوں میں ہنستا ہوا چہرا اپنا
میری امید کی ہر شاخ ہری رہتی ہے

اشرف کمال

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تنہائی سی تنہائی تھی ، کرتا بھی تو کیا میں
سو ، شہر میں صحرا کی طرح پھیل گیا میں

غزل

زمانے کا یہ رویہ سمجھ نہیں آیا
کسی کو جیسا ہوں ویسا سمجھ نہیں آیا

میں کیسے مان لوں منصف کی منصفی کہ اسے
پھٹا ہُوا مرا کرتہ سمجھ نہیں آیا

بدلنا ایک حقیقت سہی مگر تیرا
یہ اتنا جلدی بدلنا سمجھ نہیں آیا

وہ دیکھ سکتا ہے: میرا یقیں غلط نکلا
اسے خموشی کا لہجہ سمجھ نہیں آیا

خدا کی مانی نہیں اس کے ماننے والو!
مجھے تمہارا عقیدہ سمجھ نہیں آیا

سمجھ سکا ہے اگر کوئی تو بتائے مجھے
صغیر ہونا نہ ہونا سمجھ نہیں آیا

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ مجھ کو چھو کے گزرتا چلا گیا خالد
مہک رہا ہے جو مجھ میں، کہیں یہ میں تو نہیں

غزلیں

ہوئے ہیں خواب کیا بے خواب میرے
کہ شل ہونے لگے اعصاب میرے

بکھر کر رہ گیا شیرازہ میرا
دھرے سب رہ گئے اسباب میرے

تماشہ دیکھنے والے کہاں ہیں
کہاں ہیں سب کے سب احباب میرے

رمزی آثم

مجھ میں خوشبو بسی اُسی کی ہے
جیسے یہ زندگی اسی کی ہے

وہ کہیں آس پاس ہے موجود
ہو بہ ہو یہ ہنسی اسی کی ہے

خود میں اپنا دکھا رہا ہوں دل
اس میں لیکن خوشی اسی کی ہے

مسافر ہوں میں بحرِ زندگی کا
یہ لہریں میری ہیں گرداب میرے

میں اپنی رو میں بہتا جا رہا ہوں
مرے اندر ہیں سب سیلاب میرے

یعنی کوئی کمی نہیں مجھ میں
یعنی مجھ میں کمی اسی کی ہے

کیا مرے خواب بھی نہیں میرے
کیا مری نیند بھی اسی کی ہے

غزل

وہ جس میں وقت کی دریا دلی نہیں آتی
تو میرے ہاتھ پہ ایسی گھڑی نہیں آتی

سنا رہا ہے لطائف وہ بادشاہوں کو
اُداس شخص، جسے خود ہنسی نہیں آتی

دکانِ خواب سجائے ہوئے ملے ہم کو
وہ لوگ، شب کو جنہیں نیند بھی نہیں آتی

میں آٹھ سال سے ان وادیوں میں رہتا ہوں
یہ کوہِ قاف ہے لیکن پری نہیں آتی

فلک کے رخ پہ دریچے بنانے پڑتے ہیں
مکانِ ذات میں جب روشنی نہیں آتی

کلامِ میر سناتے رہو ترنم سے
ہماری آنکھ میں جب تک نمی نہیں آتی

فلک سے ٹوٹتے تارے اٹھانے پڑتے ہیں
کسی کو مفت میں جادوگری نہیں آتی

زمین اپنے خزانے لٹاتی رہتی ہے
عجیب بات ہے ان میں کمی نہیں آتی

ہماری راہ کسی اور سمت جاتی ہے
ہماری راہ میں دنیا کبھی نہیں آتی

ہوائے تازہ دکاں سے خرید سکتے، کاش!
فلک سے شہر میں اب تازگی نہیں آتی

تو صبح گھر سے مضافات جایئے اسحاق!
فضائے شور میں جب خامشی نہیں آتی

اسحاق وردگ

غزل

یا رب تری زمین تو صدموں سے بھر گئی
روشن سے دن میں دشت کی وحشت اتر گئی

تعبیر تھی جو عاقل و باصر نہ رہ سکی
تدبیر اب کے ایک بھی کب کارگر گئی

ایسی تھی کھینچ تان کہ سب خواب پھٹ گئے
ایسی خبر تھی خود سے بھی جو بے خبر گئی

حالانکہ حکم تھا کوئی گھبرائے گا نہیں
وعدے کتاب میں لکھے خلقت سنور گئی

کیسا عمل تھا پار بھی اترا نہ جا سکا
دیوار اپنے ڈھب سے ہی ہر اک نگر گئی

ان تذکروں میں ایک بھی مخلص نہ مل سکا
اس داستانِ خلق میں مخلوق مر گئی

سعدیہ بشیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ایک چھب تھی کہ نگاہوں میں گلی جاتی تھی
غرقِ دریائے انا ، ماہِ انا اپنا تھا

غزل

ہر گھڑی موت کا ڈر نہیں چاہیے
زندگی جا! یہ ٹرٹر نہیں چاہیے

میں محبت کو دنیا میں پھیلاؤں گی
مجھ کو بتلا! تجھے گر نہیں چاہیے

ایک خالی سا رکھا ہے ڈبا کوئی
مجھ کو شانوں پہ یہ سر نہیں چاہیے

رقصِ بسمل کو محدود کیسے کروں
مجھ کو اتنا بڑا گھر نہیں چاہیے

پار دریا کسی نے پکارا مجھے
ان پرندوں کو ہی پر نہیں چاہیے

عشق میں جتنی جائز ہیں سفاکیاں
ظلم کچھ اس سے بڑھ کر نہیں چاہیے

رات ہو ، کہ ہو دن کا کوئی بھی پہر
شور ، ہنگامہ و شر نہیں چاہیے

دیکھ مجھ کو کبھی تو نے دیکھا مجھے
وہ جسے زیور و زر نہیں چاہیے

رخشندہ نوید

غزل

ہمیں ایسے سُدھرنا پڑ گیا ہے
بلندی سے اُترنا پڑ گیا ہے

ہمیں بےموت مرنا پڑ گیا ہے
کِسی سے دِل لگانا پڑ گیا ہے

اداکاری بہت مہنگی پڑی ہے
حقیقت میں بھی مرنا پڑ گیا ہے

کِسی کی کھوج میں نکلا ہوں ایسے
خلاؤں سے گزرنا پڑ گیا ہے

خریداروں کی کثرت ہو رہی تھی
خوشی کا مال بھرنا پڑ گیا ہے

برستا ابر تو کچھ دیکھ پاتے
ابھی تو صبر کرنا پڑ گیا ہے

کوئی تو حُسن آیا تھا مقابل
جو شیشے کو بکھرنا پڑ گیا ہے

مجھے کھیتوں کی خاطر آبیانہ
فقط اشکوں سے بھرنا پڑ گیا ہے

مجھے تیری جبیں پر ٹانکنے تھے
ستاروں کو سنورنا پڑ گیا ہے

شہزاد احمد شیخ

غزلیں

حصارِ ہجر میں آہُو کو ہوں دبوچ رہا
عجیب شخص ہوں، کس کا بدن ہوں نوچ رہا

مجھے گدازِ محبت کے دن ہیں یاد ابھی
کہ دست و لمس میں اب تک اُسی کا لوچ رہا

کسی کی نیند سے میں بھی گزر سکا کہ نہیں
میں تختِ خواب پہ لیٹے ہوئے ہوں سوچ رہا

ڈرے ہوئے ہیں سبھی لوگ اس لیے شاید
ہر ایک دل کی عمارت میں کاکروچ رہا

یہ جب خبر ہے کہ حاصل وصول کچھ بھی نہیں
تو بار بار زمیں کو ہے کیوں کھرودچ رہا

وہ ریگ و خشت گلی سے بھی سب اُٹھائے گا
ابھی مکان کے دیوار و در ہے پوچ رہا

بلندیوں کی تمنا میں گو زقند بھری
بہت دنوں ہی مگر مبتلائے موچ رہا

آفتاب خان

مرے احساس کے سینے میں اک خنجر اُتارا تھا
جسے میں جان کہتا تھا، اُسی نے جاں سے مارا تھا

میں جب اُس شہرِ ویراں سے چلا تھا رختِ گُل تھامے
تھی اُن آنکھوں میں حیرانی، پلک پر اک ستارا تھا

مجھے جب ڈوبتے دیکھا، خوشی تھی اُس کے چہرے پر
وہاں سے پاس تھا ساحل، جہاں میرا شکارا تھا

مجھے اُس کے تبسم نے غلط فہمی عطا کی تھی
مجھے اُس کی نگاہوں نے محبت پر اُبھارا تھا

ذرا سی بھی توجہ کب، مجھے حاصل ہوئی اُس کی
بہت پُرسوز لہجے میں اُسے میں نے پکارا تھا

تری دہلیز پر پہنچا میں جب زخمِ دروں لے کر
کہاں تھا اُس گھڑی تو بھی جگر جب پارا پارا تھا

بہت تاخیر سے تم پر کھلا یہ رازِ حیرانی
جسے اپنا سمجھتے تھے، نہ وہ ہرگز تمھارا تھا

چلو یہ شکر ہے میں نے اُسی کی لاج رکھ لی ہے
اگر مَیں جیت بھی جاتا، مجھے ہونا خسارا تھا

کئی ادوار پہلے بھی یہی موسم تھے طوفانی
یہی چلتی ہوائیں تھیں، یہی رُت کا اشارا تھا

غزل

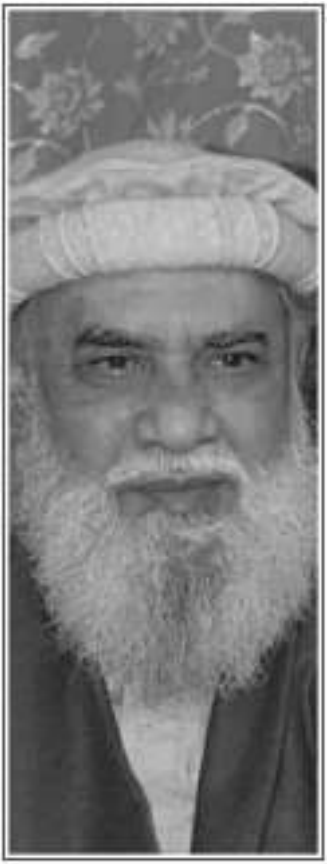

ذرا دیکھو تم اس کی خوش گمانی، ڈھونڈتا پھرتا
نہیں جس کا کوئی اس کا ہے ثانی، ڈھونڈتا پھرتا

میں بچپن ڈھونڈنے گاؤں گیا تھا جب، وہاں اک شخص
ملا مجھ کو، بڑھاپے میں جوانی ڈھونڈتا پھرتا

وہ بوڑھا جس کو سارے لوگ دیوانہ سمجھتے تھے
تھا اپنے قہقہے، شعلہ بیانی ڈھونڈتا پھرتا

عجب منظر تھا، جب اک شخص کل دریا کنارے پر
پیالہ ہاتھ میں لے کر تھا پانی ڈھونڈتا پھرتا

ملا کل مجھ کو رستے میں، وہی چنگھاڑتا دریا
زمیں پہ رینگتا پھرتا، روانی ڈھونڈتا پھرتا

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آپ بھی دیں دامن کی ہوائیں
پھول کہاں تک آگ لگائیں

غزل

غلافِ برف کو پیروں تلے مسلتا ہوا
میں آگ ڈھونڈنے نکلا تھا ہاتھ ملتا ہوا

ہوا چلی تو دکھائی دیا تھا چاند مجھے
شجر کی ڈالیوں میں کروٹیں بدلتا ہوا

چمک اُٹھی تھی وہیں پر نگہ مسافر کی
جہاں دکھائی دیا تھا چراغ جلتا ہوا

کسی نے مجھ کو پکارا تھا دُور وادی میں
اور اِک پہاڑ سے اُترا تھا میں سنبھلتا ہوا

پہنچ گیا تھا میں راشد کھلے سمندر تک
کسی خیال میں دریا کے ساتھ چلتا ہوا

محمود راشد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پرسانِ حال کون ہے ، اپنا ترے سوا
ہم لوگ کس کے نام پہ کسبِ نمو کریں

غزلیں

جمال یار کا ہر زاویہ درست لگے
کہ جیسے طاق میں جلتا دیا درست لگے

یہ سرخ ہوتی ہوئی آنکھ چپ نہیں رہتی
کوئی بھی رت ہو اِسے بولنا درست لگے

ہُوا شہید میں جاتے ہوئے خدا اپنی طرف
مرے بدن پہ لہو کی ردا درست لگے

کوئی تو ہو جو مجھے ڈھونڈتا ہوا آئے
کوئی تو ہو کہ جسے ڈھونڈنا درست لگے

فریب، قوسِ قزح کو بھی دل کہے، لیکن
تری ہتھیلی پہ رنگِ حنا درست لگے

عجیب شخص ہوں خود کو غلط سمجھتا ہوں
مجھے ہمیشہ کوئی دوسرا درست لگے

بھنور کے گھاٹ اترتے مسافروں کو سعید
لگے تو کیسے بتا ناخدا درست لگے

سعید راجا

دیدۂ و دل میں سرایت نہیں کرنے والا
عشق بے وجہ کرامت نہیں کرنے والا

جس نے پڑھ رکھی ہے مکہ سے مدینہ ہجرت
وہ امانت میں خیانت نہیں کرنے والا

خود پہ بھی مجھ کو بھروسہ ہے خدا پر بھی ہے
میں زمانے کی شکایت نہیں کرنے والا

ایک امیدِ سحر تاب کو رکھتا ہے امام
دل شبِ تار کی بیعت نہیں کرنے والا

آمد و رفت ہے سانسوں کی اسی کے دم سے
میں کبھی ترکِ محبت نہیں کرنے والا

حجرۂ خوف میں بیٹھا ہے جو سہما ہوا شخص
آیتِ عشق تلاوت نہیں کرنے والا

اشک آنکھوں سے بہے جاتے ہیں چپ چاپ سعید
اور میں کوئی وضاحت نہیں کرنے والا

غزل

گلوں پہ اوس پڑی، خاک میں نمی جاگی
تھکن سے اُونگھتے منظر میں تازگی جاگی

عجیب عالمِ بیداری میں سفر گزرا
کہ ہر مقام پہ مجھ میں تری کمی جاگی

چمن سے جا چکا تھا پھول لے کے شہزادہ
جب اپنے خوابِ سحر سے بکاؤلی جاگی

نہ گہرے سکتے سے پھر قصہ گو نکل پایا
نہ داستان میں سوئی ہوئی پری جاگی

نہ اپنے آپ میں یکسو کبھی ہوئے ہم تم
نہ لاشعور میں خوابیدہ روشنی جاگی

میں خوف اوڑھ کے لیٹا تھا، ہڑبڑا کے اٹھا
وہ خواب تان کے سوئی، ہنسی خوشی جاگی

دُعا میں جاگ کے راتیں گزار دیں ہم نے
مگر نہ قسمتِ خفتہ تری مری جاگی

چکور قومی پرندہ تھا جن پکھیروں کا
اُنھی کے دل میں محبت نہ چاند کی جاگی

ہمارے قطبی جزیرے پہ رات تھی اب تک
مہینوں بعد یہاں دُھوپ سی کوئی جاگی

ندی کو دیکھتے رہنے سے لہر اٹھی مجھ میں
چمن کو سوچتے رہنے سے سبزگی جاگی

نظامِ کون و مکاں حدِ انتشار پہ تھا
جب انتظامیہ کون و مکان کی جاگی

نوائے صُورِ سرافیل ہی سے جاگے گی
ہماری مُردہ ضمیری اگر کبھی جاگی

قیامت آئی تو دہشت سے کُھل گئیں آنکھیں
خدا کو دیکھا تو دل میں اُمید سی جاگی

شاہد ماکلی

غزل

ہم نے کب رونقِ بازار سے حصّہ مانگا
دوسری سمت نکلنے کو ہے رستہ مانگا

چھاؤں مانگی ہے درختوں کی، نہ بادو باراں
جب بھی مانگا تری دیوار کا سایہ مانگا

صحنِ دربار میں گنبد سے پرندے اترے
بانجھ عورت نے جو روتے ہوئے بچہ مانگا

اِک قیامت تھی قیامت کی گھڑی سے پہلے
ایک والد نے جو اولاد سے قرضہ مانگا

روزِ تقسیم سبھی مانگ رہے تھے آنکھیں
میں نے پہچان کی خاطر کو تھا چہرہ مانگا

دِل تو کیا گھر سے نکلنے کو تری یادوں نے
پیر پکڑے ہیں نکلنے کو ہے رستہ مانگا

غم پُرانا ہو تو لذت ہی چلی جاتی ہے
اِس لیے آپ سے اِک زخم ہے تازہ مانگا

عُمر بھر ساتھ نبھانا ہو تو حق بنتا ہے
کیا بُری بات ہے اِس میں، ترا آجرہ مانگا

گرچہ تُرکے میں تھا والد نے بہت کچھ چھوڑا
پھر بھی بیٹی نے بہت شوق سے بیکہ مانگا

مُجھ کو دانش نے بتایا کہ علاجِ غم ہے
اِس لیے آپ سے بازو کا ہے تکیہ مانگا

دانش عزیز

غزل

عکسِ رُخِ جمال کے وہ خال اور خد
دریاؤں کے بہاؤ میں جیسے کہ شد و مد

قصے تجلیوں کے بہت کم ہوئے بیاں
تشدید میں مزید کرو ایک اور شد

حیران کر دیا مجھے اسلاف نے مرے
نازاں ہوں کیا کمال تھے آباو اور جد

کتا وفورِ عشق میں قدموں سے آ لگا
انسان کر چکا اسی کارِ ہنر کو رد

آؤ کہ حرفِ نحو میں اک تجربہ کریں
تختی کے سب حروف میں ڈالیں مزید مد

فرخندہ شمیم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد وہ مجھے ہنسا ہنسا کر
کچھ اور اُداس کر گیا تھا

غزل

دن گزر جاتا ہے تو رات ڈھلے آتا ہے
چاند تو چاند ہے سندور مَلے آتا ہے

یہ زمانے کا چلن ہے تو شکایت کیسی
جس کو سینے سے لگاؤ وہ گلے آتا ہے

واقعہ یہ ہے ہمیں چھوڑ کے جانے والا
واپس آتا ہے تو پھر ہاتھ مَلے آتا ہے

بے سبب سر پہ اٹھایا ہوا ہر شخص یہاں
دیکھتے دیکھتے پاؤں کے تلے آتا ہے

شب ڈھلے غور سے دیکھا تو وہ اک توبہ شکن
دھیرے دھیرے مری جانب ہی چلے آتا ہے

محمد حفیظ اللہ بادل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چھنک اُٹھے ہیں مرے حلق میں وہی گھنگھرو
بس ایک سانس بچا ہے مری رہائی میں

غزل

ہیں ایسے لوگ جو دل میں دعا نہیں رکھتے
وہ اپنا ظاہر و باطن ہرا نہیں رکھتے

ہو عشق بازی کسی سے کہ ہو سخن سازی
ہم اپنی سانس کہیں بھی بھلا نہیں رکھتے

یہ ٹھیک ہے کہ تمھیں غم اثر نہیں کرتے
میں کیسے مان لوں کہ دل بھرا نہیں رکھتے

جو اہلِ ظرف ہوں بڑھتے چلے ہی جاتے ہیں
سفر کی دھول سروں پر اُٹھا نہیں رکھتے

اُنھیں ہے زعم بہت مال و زر وہ رکھتے ہیں
مجھے یقیں کہ وہ کوئی خدا نہیں رکھتے

اُلجھ نہ پڑنا سمجھ کر ہمیں بس اک شاعر
اگرچہ اپنا گریباں کھلا نہیں رکھتے

اعجاز روشن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھا نہ ہمیں تُو نے خط و خال سے آگے
اک شہر تھا، اس شہرِ مہ و سال سے آگے

غزل

کنارا خود نہیں ملتا کنارا ڈھونڈھ لیتا ہوں
بسا اوقات تنکے کا سہارا ڈھونڈ لیتا ہوں

یہی حسنِ گماں ہے جو مجھے دل شاد رکھتا ہے
میں نفرت میں محبت کا اشارا ڈھونڈ لیتا ہوں

مجھے اچھا نہیں لگتا کہ کوشش رائیگاں جائے
نہیں ملتا تو میں اس کو دوبارہ ڈھونڈ لیتا ہوں

مری مٹی میں آمیزش ہے جانے کس اذیت کی
میں کارِ منفعت میں بھی خسارا ڈھونڈ لیتا ہوں

دیارِ عشق راضی ہو مری تعظیم پر ورنہ
یہاں سے کوچ کرنے کا اشارا ڈھونڈ لیتا ہوں

عداوت پر اتر آتی ہے ظلمت آشنا دنیا
جو میں تاریکیِ شب میں شرارہ ڈھونڈ لیتا ہوں

طالب انصاری

غزلیں

نفرت ہے مجھے پیار سے، الفت سے، وفا سے
اُجڑا ہے دلِ وحشی، حسینوں کی ادا سے

ملنے کا جو وعدہ ہے اسے اب کے وفا کر
یوں دے نہ محبت میں مجھے اور دلا سے

اس زخمِ تمنا کا نہیں کوئی بھی چارہ
بھرتا نہیں ہرگز یہ دوا سے نہ دعا سے

دنیا کی نمائش سے کیا ہم نے کنارہ
اک چین ملا، لو جو لگالی ہے خدا سے

ہر بات پہ ہوتا ہے محبت کا گماں سا
وہ غنچہ دہن بات کرے ایسی ادا سے

شوکت محمود شوکت

کیا کہا، کیوں کر کہا، کس کو کہا، کیسے کہا؟
سوچتا ہوں، اس نے مجھ کو بے وفا، کیسے کہا؟

زندگی، اپنی گزرتی جا رہی ہے تیرے بن
زندگی کو پھر بتا، اچھا، بھلا، کیسے کہا؟

پھول کی کیا زندگی ہے؟ سوچنا تنہائی میں
پھول کو ممکن نہیں کوئی فنا، کیسے کہا؟

آج کل مخلص نہیں کوئی، جہاں میں دیکھ لے
آج کل کے آدمی کو باوفا، کیسے کہا؟

شیدا ہیں تری مست نظر کے سبھی ساقی!
جائیں تو کہاں جائیں مئے عشق کے پیاسے

میرے لیے اپنی ہی زمیں، خُلدِ بریں ہے
کم تر تو نہیں خاکِ وطن، خاکِ شفا سے

جیسا کہ ستاروں میں ہو مہتاب درخشاں
لگتے ہیں بھری بزم میں وہ اتنے، جدا سے

بچپن سے ترے عشق میں ڈوبا ہوا، شوکت
کھائے نہ کوئی خوف کسی موجِ فنا سے

راہ گیروں کے لیے روشن رہا جو رات بھر
آؤ مل کر توڑتے ہیں وہ دیا، کیسے کہا؟

در بدر پھرتا رہا ہوں میں تلاشِ یار میں
مجھ کو پھر آساں طلب، جانِ ادا! کیسے کہا؟

عشق کا انجام رسوائی بجز ہے اور کچھ؟
عشق میں شوکت بہت، رسوا ہوا، کیسے کہا؟

غزلیں

میدانِ شوق عرصۂ پیکار بن گیا
ہر پھول تیرے پیار کا اب خار بن گیا

پہلے پہل تھا وہ مری یادوں کا ہمسفر
اب رفتہ رفتہ زیست کا حقدار بن گیا

وہ جس کی آرزو میں کٹی میری زندگی
افسوس میرے حق میں وہ تلوار بن گیا

کیا جانے کس طرف مجھے لے جائے بے خودی
اے دشتِ شوق! میں تو ترا یار بن گیا

جاوید! کیسے منزلِ مقصود پائیں ہم
ظالم زمانہ راہ کی دیوار بن گیا

جاوید صدیق بھٹی

پھر تری یاد دل جلانے لگی
آنکھ اشکوں سے ڈبڈبانے لگی

موسموں کے اداس چہرے میں
تیری صورت اثر دکھانے لگے

جب خزاں نے گرا دیے پتے
تیز آندھی انھیں اُڑانے لگی

درد کے یاس خیز لمحوں میں
شامِ ہجراں بھی مسکرانے لگی

زندگی وہ عذاب ہے جاوید
جو مرے دل کو ڈگمگانے لگی

غزل

کیسی برکت ترے درود میں ہے
اک ستارہ مرے وجود میں ہے

وسوسے، ڈر، گمان ہیں سب ہیچ
اک یقیں اب مرے ورود میں ہے

سرحدوں پر بھی ہے نظر میری
دائرہ کار بھی حدود میں ہے

کب مزا ہے کسی رہائی میں
جو مزا عشق کی قیود میں ہے

سارا کمرا مرا معطر ہے
تیرا احساس مشکِ عود میں ہے

تیرے جانے سے یوں ہوا محسوس
جیسے سارا جہاں جمود میں ہے

ایک دنیا میں ہے وجود مرا
ایک دنیا مرے وجود میں ہے

اپنے افکار باوضو کر لو
مکتبِ عشق اب نمود میں ہے

یہ پیامِ سحر ہے نوشابہ
اک صباحت مرے ورود میں ہے

نوشابہ ہاشمی

غزل

تماشے میں بڑے کردار میں ہیں
پیادے جُبہ و دستار میں ہیں

بلا کے کرب کی شہ سرخیاں آج
بشر کی آنکھ کے اخبار میں ہیں

وہ جل کر راکھ ہو جائیں گے آخر
جو پیہم آگ سے تکرار میں ہیں

مرا ہر لفظ ہے اک جاگتی رات
کئی چلّے مرے اشعار میں ہیں

ہمارے خواب تک گروی ہیں عاطر
تو گویا ہم کسی بازار میں ہیں

عاطر عثمانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سامان بہم کر ، کہ نہ لوٹے کبھی خالی
یا رب ، کوئی مجھ بے سر و سامان کے در سے

غزل

ریت پر رکھی ہوئی تھی برف پانی بن گئی
اک خیال آیا تصوّر اور کہانی بن گئی

جس نے روٹھے کو منایا ہے بصدقِ دل اُدھر
شامِ غم اس شخص کی بے حد سہانی بن گئی

جب یقیں اک دوسرے سے اُٹھ گیا تو یہ ہُوا
راہ و رسمِ دوستی پھر بدگمانی بن گئی

کربلا کی داستاں جس نے سنائی تھی وہاں
خود بخود فوراً سے پہلے نوحہ خوانی بن گئی

جس غزل کو گا رہے ہیں یہ غزل گائیک سبھی
وہ حقیقت میں سخنور کی نشانی بن گئی

دُکھ مکمل جب ہُوا میرا تصوّر اُس گھڑی
نامکمل تھی مکمل زندگانی بن گئی

تصور اقبال

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آئینے جان کے خاموش رہے ہیں خالد
ہم تو بے کار پشیماں ہوئے دلگیر ہُوے

غزلیں

کوئی بُت بھی نہیں ہے آستیں میں
گماں کے سانپ پلتے ہیں یقیں میں

یہ کیسے لوگ بستے ہیں یہاں پر
ہمیں رکھیں نگاہِ خشمگیں میں

دما دم ہو رہی ہے ہر گھڑی اب
یہ کیسے اژدھے ہیں آستیں میں

دِلا حُسنِ نظر کا سب ہے جادو
بڑا ہی ناز ہے اس نازنیں میں

ستارے بھی دمکنے لگ گئے ہیں
قمر ایسا کِھلا ہے چودھویں میں

پھلے پھولے یہ پاکستان سیّد
اسے پایا دعائے مرسلیں میں

سید مقبول حسین

ستارہ تو یونہی افلاک کے چکر میں رہتا ہے
ہمیشہ رات کا منظر پسِ منظر میں رہتا ہے

ہوا کا کیا ہوا اکثر مخالف سمت چلتی ہے
پرندہ ہے وہی اچھا جو اپنے پر میں رہتا ہے

سفر دشتِ جفا کا جان لیوا ہے مگر سائیں
یہ طفلِ عشق بھی ہر دم جنوں کے گھر میں رہتا ہے

اسے چھولوں تو میرے ہاتھ سے خوشبو نکلتی ہے
نہ جانے کون ہے جو پھول کے پیکر میں رہتا ہے

وہ ایسا گل بدن دکھنے میں جو شیشے سے تھا نازک
چھوا تو یوں لگا جیسے کسی پتھر میں رہتا ہے

کبھی مقبول خلعت کی تمنا کی نہیں میں نے
کہ یہ درویش تو بس اپنی ہی چادر میں رہتا ہے

غزل

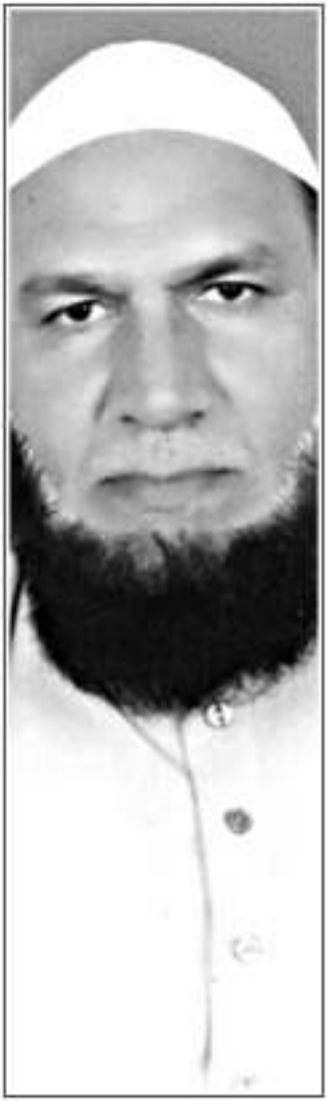

مر جاؤں نہ کیوں پھر سرِ بازار گری ہے
روٹی کی طلب میں مری دستار گری ہے

گھائل ہوئے پھرتے ہو فقط ایک ادا سے
یہ برق مری جان پہ سو بار گری ہے

سنتے ہیں کہ پھر اس نے تو پانی نہیں مانگا
جس پر بھی کڑے وقت کی تلوار گری ہے

یہ میری تمنا ہے بڑے لاڈ سے پالی
قدموں پہ مرے ہو کے جو ناچار گری ہے

خورشیدِ ضیابار سے آنکھوں میں چمک ہے
صد شکر کہ پھر رات کی دیوار گری ہے

گاتے ہوئے جاتی تھی سرِ شام اُفق کو
کیا جانیں کہاں کونجوں کی وہ ڈار گری ہے

رخسار کی پتی پہ سرِشام رضا آج
اک بوند سی پانی کی لگاتار گری ہے

رضا اللہ حیدر

غزل

اشک آنکھوں میں چھپانے کا ہُنر سیکھ گئے
آگ پانی میں لگانے کا ہُنر سیکھ گئے

عشق میں پھول کھلانے کا ہنر سیکھ گئے
نار گلزار بنانے کا ہُنر سیکھ گئے

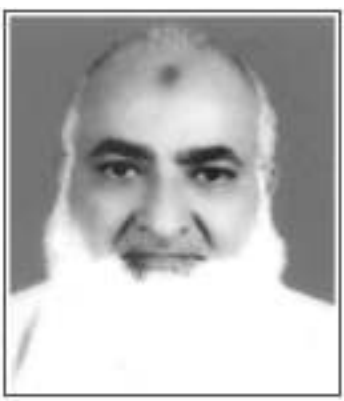

چاہیے جذبۂ ایثار لہو دینے کو
اور ہم خون بہانے کا ہنر سیکھ گئے

ہم نے تاریکیوں سے ہاتھ ملانا سیکھا
ہم چراغوں کو بجھانے کا ہنر سیکھ گئے

نام پر روشنی کے ہم نے تباہی کر دی
بستیاں اپنی جلانے کا ہُنر سیکھ گئے

بزدلی اپنے لیے مصلحت اندیشی تھی
گردنیں اپنی جھکانے کا ہنر سیکھ گئے

سینے میں بھائیوں کے تیر ترازو کر کے
ہم محبت کو مٹانے کا ہُنر سیکھ گئے

دھوپ سچائی کی چمکی تو یہاں لوگ عقیلؔ
جھوٹ کے پیڑ لگانے کا ہُنر سیکھ گئے

عقیل رحمانی

غزل

جب نظر اُس کے رُخ پہ ڈالتا ہوں
زخم ہر روز ایک پالتا ہوں

پھر نیا روپ لے کے آتی ہیں
دل سے یادوں کو جب نکالتا ہوں

وار جس وقت بھی ہوا مجھ پر
اُس کا الزام خود پہ ڈالتا ہوں

پاؤں اُٹھتے ہیں اس گلی کی طرف
کس مشقت سے خود کو ٹالتا ہوں

عابدی مجھ سے شاعری ہے بعید
میں فقط لفظ کو اجالتا ہوں

علی حسین عابدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ان سرابوں میں کہاں پانی تھا
موجۂ ریگِ رواں پانی تھا

غزلیں

بیکار شہرِ ہجر کا نقصان ہو گیا
پیدا تمہارے وصل کا امکان ہو گیا

سنتے ہی میں نے ہاتھ سے تلوار پھینک دی
تُو نے کہا جو وہ مرا ایمان ہو گیا

یہ عشق ایک عمر ضرورت رہا مری
پھر ایک روز فالتو سامان ہو گیا

تجھ کو خبر ہے شہر سے ہجرت میں کر گیا
تجھ کو خبر نہیں ترا نقصان ہو گیا

پھر آئینے سے آج مرا سامنا ہوا
اور یوں ہوا کہ آئینہ حیران ہو گیا

سگریٹ کی راکھ جھاڑ کے غم بھی جھٹک دیئے
آسان کام اور بھی آسان ہو گیا

جی بھر کے کر رہا ہوں میں اپنی مدارتیں
شاہد میں آج اپنا ہی مہمان ہو گیا

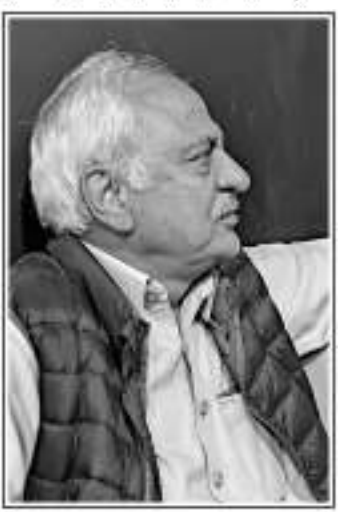

افتخار شاہد

وصال راتوں سے پوچھتا ہے کہ خواب سارے کدھر گئے ہیں
ہمارے پیچھے جو آ رہے تھے وہ ہجر مارے کدھر گئے ہیں

تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ عشق زادوں کا کیا ہوا ہے
تمہارے لہجے سے کھل گیا ہے جو کھیل ہارے کدھر گئے ہیں

ہماری آنکھوں میں جلنے والے دیے ہواؤں نے کھا لئے ہیں
تمہاری زلفوں میں اگنے والے وہ چاند تارے کدھر گئے ہیں

ہمارے چہرے کی لالیوں پہ تو نیم زردی کھنڈی ہوئی ہے
تمہاری آنکھوں میں بسنے والے حسیں نظارے کدھر گئے ہیں

درختِ جاں پر جو نام لکھا تھا اس کو پانی نگل گیا ہے
خبر نہیں ہے ہمارے دریا کے دو کنارے کدھر گئے ہیں

غزل

خواب تھا وہ عجیب منظر کا
پھول دیکھا تھا میں نے پتھر کا

میں نے جانا تھا پار صحرا کے
راستہ تھا کٹھن سمندر کا

سانپ نے ڈس لیا شکاری کو
جب نشانہ کیا کبوتر کا

اِک مداری کی بھوک تھی یارو!
وہ تماشا نہیں تھا بندر کا

دیکھا باہر تو تب یقیں آیا
خوب موسم تھا آج اندر کا

بچے بچے کو فون چاہیے ہے
مسئلہ یہ ہے آج گھر گھر کا

نیند تو آ نہیں رہی کیفی!
فائدہ اور کیا ہے بستر کا؟

محمود کیفی

غزل

تیری باتوں سے بھی خوشبو آتی ہے
اپنا پس منظر بھی یار دہاتی ہے

مجھ سے گہرا رشتا ہے بربادی کا
میرے گھر یہ بن پوچھے آ جاتی ہے

کوئی دوڑ رہا ہے پیچھے دنیا کے
اپنے پیچھے دنیا دوڑتی آتی ہے

کتنی شرمیلی ہے لڑکی گاؤں کی
اندھوں سے بھی اپنا آپ چھپاتی ہے

میرے ذہن میں چرخے گھومنے لگتے ہیں
اتنی تیزی سے وہ بات گھماتی ہے

بن جاتا ہے وہ قانون محبت کا
جو کچھ میری شہزادی فرماتی ہے

اس جھگڑے سے ساتھی پیچھے ہٹ جائیں
اپنی ذات سے میرا جھگڑا ذاتی ہے

بعد کسی کے انصر ایسے پھرتا ہوں
جیسے کوئی کونج کہیں کرلاتی ہے

انصر حسن

غزل

کتنا روشن ہے مگر شام کے بعد
جب سے لوٹا ہے وہ گھر شام کے بعد

کیسے گلزار سے ہو جاتے ہیں!
اس کی یادوں کے شجر شام کے بعد

اس کو رکنا تھا یہاں صدیوں تک
یہ جو ہے محوِ سفر شام کے بعد

مے کدے آنکھ سے اوجھل ہو جائیں
وہ جو آ جائے نظر شام کے بعد

سرمگیں نظروں سے دیکھا اس نے
شام ہے بارِ دگر شام کے بعد

کیسے چپ چاپ ہوئے دل کے مکیں
کیسا اجڑا یہ نگر شام کے بعد

قافلے دل کے رکے جاتے ہیں
اس نے بدلی ہے نظر شام کے بعد

بشیر احمد حبیب

غزل

ہماری اک کہانی کھو گئی ہے
تھی جس میں زندگانی کھو گئی ہے

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہیں کیا
یوں لفظوں سے روانی کھو گئی ہے

میں واپس عمر کی دلدل میں اتروں؟؟
وہیں میری جوانی کھو گئی ہے

جفائیں عام ہوتی جا رہی ہیں
وفا کی حکمرانی کھو گئی ہے

نیا تو دسترس میں کچھ نہ آیا
انا تھی خاندانی، کھو گئی ہے

جسے کہتے تھے اخلاص و مروت
وہ آبا کی نشانی کھو گئی ہے

ہے اب تو بدگمانی ہی مقدر
جو تھی وہ خوش گمانی کھو گئی ہے

یہ چہرہ اور چہرہ ہے ثمینہ
مری صورت پرانی کھو گئی ہے

ثمینہ سیّد

غزل

فرقت کا بوجھ ہم سے اُٹھایا نہ جا سکا
پلکوں پہ کوئی خواب سجایا نہ جا سکا

تم کیا گئے کہ گیت کہیں دُور کھو گئے
پھر سازِ دل پہ راگ سنایا نہ جا سکا

ہم تو بھلا چکے تھے ستم ہائے زندگی
اک وہ ستم ظریف بھلایا نہ جا سکا

پھر یوں ہوا گمان کا اِمکان رہ گیا
دل کا جو حال تھا وہ بتایا نہ جا سکا

بے آب و دشت چھوڑ کے جب تم چلے گئے
صدق و وفا کا خواب دکھایا نہ جا سکا

ہم زندگی کی دوڑ میں ماضی سے کٹ گئے
عکسِ خیال یار مٹایا نہ جا سکا

طلعت شبیر

غزل

اپنے بکھرے ہوئے سب خواب اٹھائے ہوئے لوگ
ہجر کے زخموں سے چہروں کو سجائے ہوئے لوگ

راستہ بھول گئے اپنے گھروں کا، آخر
دیر سے لوٹ کے بستی میں سب آئے ہوئے لوگ

قد و قامت نہیں القاب سے اونچا ہوتا
فرد یکتا ہیں ہر اک بزم میں چھائے ہوئے لوگ

کیسے انمول صفت بزم میں کل تھے موجود
سامنے آنکھوں کے پھر سب وہ پرائے ہوئے لوگ

خواہشیں ذبح ہوئیں وقت کے کُند خنجر سے
گردشِ دوراں کے ہم بھی ہیں ستائے ہوئے لوگ

گھر سے باہر کھڑے نظارہ دنیا دیکھیں
ہم ہیں تنہائی کے ہاتھوں سے مٹائے ہوئے لوگ

یہ الگ بات ہمیں پیار نہ راس آیا مگر
جیتنے دیں گے نہ تم کو یہ گنوائے ہوئے لوگ

جن سے قائم ہیں ابھی تک غمِ دل کے رشتے
ہم نے آنکھوں میں ہیں اپنی وہ بسائے ہوئے لوگ

ہم نے ہر بزم میں جا کر یہی منظر دیکھا
مسکراہٹ میں ہیں اشکوں کو چھپائے ہوئے لوگ

صرف اک میں ہی نہیں ہوں سرِ محفل موجود
آج گھر میں ہیں مرے سارے ہی آئے ہوئے لوگ

دل کو ہر پل یہی دھڑکا سا لگا رہتا ہے
چھین لے کوئی نہ ہم سے یہ بچائے ہوئے لوگ

جب بھی طاہرؔ میں کبھی اُسکی گلی سے گزرا
یاد پھر آئے بہت مجھ کو بھلائے ہوئے لوگ

طاہر ناصر علی

غزل

جاگ پائی نہ عاشقی مجھ میں
کیسے آئی ہے یہ کمی مجھ میں

کوئی اُمید دِل میں جاگی ہے
چھن رہی ہے جو روشنی مجھ میں

اک جنوں سا جو تھا مرے اندر
چھپ کے بیٹھا ہے آج بھی مجھ میں

پیاس بجھتی نہیں ہے، پینے سے
بھر گیا ہے وہ تشنگی مجھ میں

عشق تیرا مجھے نچاتا ہے
گنگناتی ہے زندگی مجھ میں

دل کی باتیں نہیں میں کر پاتا
آ بسی کیسی بے بسی مجھ میں

اُس کو فاروقؔ آج دیکھا تو
جاگی اُمید اک نئی مجھ میں

زبیر فاروق

غزل

نظر میں وسعت کمال رکھو
دُکھی دلوں کا خیال رکھو

اُداسیوں کو شکست دے کر
مسرتوں کو بحال رکھو

یہی تقاضا ہے لفظِ کُن کا
دلوں سے نفرت نکال رکھو

اگر ہے فن پہ یقین تم کو
جواب میں بھی سوال رکھو

ضمیر شیشہ ہے گر سلامت
فریب کو پھر نہ ڈھال رکھو

کہا تھا کس نے صنم بسا کے
خدا کے گھر میں ملال رکھو

جو کر دے حیراں سبھی کو شاہدؔ
ہنر میں ایسا کمال رکھو

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

اکثر زبانِ حال سے کچھ بولتا بدن
منہ بند رکھ کے دل کی گرہ کھولتا بدن

انکار کر کے پاس بلاتی ہوئی نظر
میزانِ رخ پہ جنسِ ہوس تولتا بدن

آنکھوں سے لے کے روح کی گہرائیوں تلک
شیرینیاں نچوڑ کے رس گھولتا بدن

قرب و گریز کے سبھی اَسرار سر بسر
فیاض ساعتوں میں مگر کھولتا بدن

محرومیوں پہ نوحہ کناں جوہرِ حیات
مٹی میں اپنے لعل و گہر رولتا بدن

فیضانؔ بن گلابِ انا الحق کا عندلیب
دار و رسن کی شاخ پہ رکھ ڈولتا بدن

فیض رسول فیضان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد وہ تھکن تھی کہ تہِ سایۂ مژگاں
دیوارِ خمیدہ کی طرح بیٹھ گیا میں

غزل

محبتوں کی کرامت بھی ہار جانے لگی
کہ اب طویل مسافت ہمیں تھکانے لگی

کشادہ دل تھا بنا آخر احتیاط پسند
بزرگ باپ کی اولاد جب کمانے لگی

دیے کی آنکھ سے دیکھا ہے پھول کا چہرہ
نظر میں لو کسی صورت کی جھلملانے لگی

ہٹائیں چاند سے نظریں تو پھر تمہاری یاد
کسی گلاب کی ٹہنی پہ لہلہانے لگی

حقیقتوں سے کہیں آ ملی خیال کی رو
چہار سمت سے آواز کوئی آنے لگی

رگوں میں دوڑتے جذبوں میں اشتعال آیا
بہار آئی تو کیا کیا نہ گل کھلانے لگی

اکرم جاذب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس قدر کرب سے اک کرب کا اظہار ہُوا
عجز اظہار مری راہ کی دیوار ہُوا

غزل

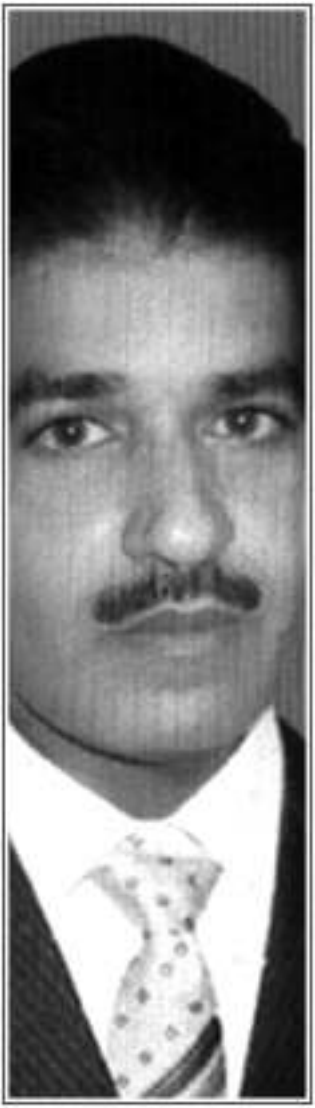

مرا دل آگ سے پُر ہے مری آنکھوں میں پانی ہے
مرا ظاہر مرے اندر کی پوری ترجمانی ہے

زمیں کی ناؤ سے باہر نکل کر میں کہاں جاؤں
مرے چاروں طرف پھیلا ہوا پانی ہی پانی ہے

ملاقاتوں کے پَل جو بارہا ضائع کیے میں نے
یہ میرے لاابالی پن کی ساری مہربانی ہے

گھری جاتی ہے خود غرضی کی ظلمت میں زمینِ دل
کوئی احساس کی لَو حجلۂ جاں میں جگانی ہے

جسے یہ ظلم کرنے کی ہے آزادی زمانے میں
زمیں پر یہ نئی مخلوق کوئی آسمانی ہے؟

زمانے ہو گئے مہتاب کو چھوڑے مدار اپنا
مگر قلب و جگر پر اب تک اس کی حکمرانی ہے

ابھی دستِ ستم کیوں کھینچتے ہو اے ستم پرور!
ابھی تو شہر میں مشہور میری سنگ جانی ہے

اتر آئی ہے برکھا رُت تری آنکھوں میں پہلے ہی
ابھی تو داستاں غم کی تجھے فرحاںؔ سنانی ہے

سرور فرحان

غزلیں

دیکھا نہیں تھا اُس نے نظر بھر کے آس پاس
موجود ہم بھی تھے کہیں منظر کے آس پاس

لگتا ہے پھر کسی نے یہاں کی ہے خودکشی
بیٹھے ہوئے ہیں لوگ سمندر کے آس پاس

تنہا کسی کی یاد نے ہونے نہیں دیا
کھلتے ہیں روز پھول مرے گھر کے آس پاس

مرنے کے بعد لی نہ کسی نے مری خبر
اگنے لگے ہیں خار مرے گھر کے آس پاس

یہ خودکشی حکیم نہیں واردات ہے
بکھرا ہوا ہے خون بھی بستر کے آس پاس

حکیم خان حکیم

ہم نے قضا سے درد کی تدبیر مانگ لی
بجھتے ہوئے چراغ سے تنویر مانگ لی

اُس کے رُخِ جمال سے جب رنگ اُڑ گیا
روٹھے ہوئے خیال سے تصویر مانگ لی

جب دن مری حیات کے سب خواب ہو گئے
پتھر مزاج یار سے تعبیر مانگ لی

چرخِ سخن پہ بجھنے لگے جب مرے حروف
خونِ جگر سے شعر کی تاثیر مانگ لی

جس روز اُس کا لطف و کرم سب پہ عام تھا
ہم نے خدا سے درد کی جاگیر مانگ لی

رکھنا تھا ہم کو دشتِ طلب کا بھرم حکیم
ہر گام اُس کے پیار سے تعزیر مانگ لی

غزلیں

اک آوارہ ہوک
سناٹے کی کوک

میرا جسم نہ کاٹ
مجھ میں پلتی بھوک

دریا دریا جھوم
آئینے پر تھوک

میرا عشق مجاز
تیرا حسن سلوک

تو منزل کی چھاپ
میں رستہ متروک

عادل کر آزاد
دل میرا مملوک

عزیز عادل

رنگ ہے روشنی ہے تو ہے ابھی
ہر خوشی میرے روبرو ہے ابھی
میری آنکھوں کی سبز کھیتی میں
اک ترے خواب کی نمو ہے ابھی
میں تجھے سوچنے سے قاصر ہوں
میں تجھے دیکھتا ہوں، تو ہے ابھی
ساغر و مینا ہیں بہم لیکن
تیرا ہونا مجھے سبو ہے ابھی
تو مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے
پر تصور میں روبرو ہے ابھی
میں ترے حافظے میں رہتا ہوں
یعنی الفت کی آبرو ہے ابھی
مہرباں تیری مہربانی سے
درد کی سانس مشکبو ہے ابھی
وہ ہے خنجر بدست، ہو عادل
گرم اپنا بھی کچھ لہو ہے ابھی

غزل

جو تھا نہ کسی کا، وہ ہمارا بھی نہیں تھا
پر اُس کے بِنا اپنا گزارہ بھی نہیں تھا

کرتا تھا برائی جو مرے آگے تمہاری
میرا تو نہیں تھا، وہ تمہارا بھی نہیں تھا

میں ڈوب رہا تھا تو فقط اُس نے بچایا
حالانکہ اُسے میں نے پکارا بھی نہیں تھا

جلدی تھی اسے آنے کی سب ہی کے مقابل
صدقہ تو ابھی میں نے اتارا بھی نہیں تھا

خواہش تھی سبھی کی کہ گرفتار ہوں اُس کے
زلفوں کو ابھی جس نے سنوارا بھی نہیں تھا

رخصت وہ ہوا جونہی، پریشان ہوں تب سے
رکنے کے لیے میں نے پکارا بھی نہیں تھا

اب روتے ہو تم ہجر میں بھر بھر کے یوں آہیں
ہر چند کہ وہ راج دلارا بھی نہیں تھا

تھی مجھ کو ضرورت بھی اُسی فیض رساں کی
احسان مگر اُس کا گوارا بھی نہیں تھا

اک حور کی مانند وہ لگتی تھی سراسر
جنّت سے جسے رب نے اتارا بھی نہیں تھا

تھی رات بہت کالی، اجی! چاند کو چھوڑیں
اُس رات فلک پر تو ستارہ بھی نہیں تھا

اِس کھیل میں پڑنے سے تھا دونوں کو تذبذب
اِس کھیل میں حالانکہ خسارا بھی نہیں تھا

چاہا تھا لگے آگ محبت کی اُدھر بھی
اُس دل میں تو ہلکا سا شرارہ بھی نہیں تھا

بے سمت ہی بڑھتی رہی کشتی یہ ہماری
اس بحرِ محبت کا کنارا بھی نہیں تھا

آئے ہیں سبھی یار، ضیاؔ! سننے کو غزلیں
تم نے تو ابھی اِن کو سنوارا بھی نہیں تھا

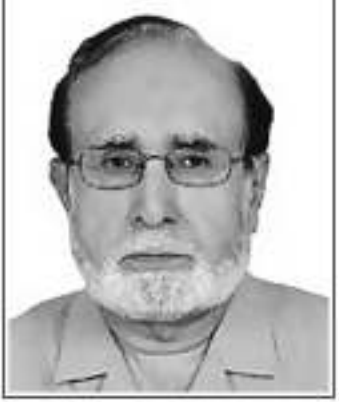

سید ضیا حسین

غزلیں

اک اسی کا سوال تھے ہم بھی
کس قدر باکمال تھے ہم بھی

ہم اسیرانِ غم کے چہرے پڑھ
غم کی زندہ مثال تھے ہم بھی

سانس لینا بھی مسئلہ تھا ہمیں
وہ بھی غم سے نڈھال تھے ہم بھی

ایک دشمن کی موت پر صاحب
جانے کیوں پُر ملال تھے ہم بھی

وہ بھی تھے بوجھ سر کا اے امجد
اور جاں کا وبال تھے ہم بھی

محمد امجد حسین

خواب کا سلسلہ نہیں معلوم
درد کا راستہ نہیں معلوم

غمِ دوراں ہو یا غمِ جاناں
مجھ کو اپنا پتہ نہیں معلوم

درمیانِ چراغ و موجِ ہوا
جو بھی ہے مسئلہ نہیں معلوم

میرے دل نے جدائی کا صدمہ
کس طرح سے سہا نہیں معلوم

الجھنوں سے نکل سکوں کیسے
جب کوئی راستہ نہیں معلوم

حال دل کا بیان کیسے کروں
درد کا حاشیہ نہیں معلوم

دل سے دل تک حسین امجد کو
کتنا ہے فاصلہ نہیں معلوم

غزلیں

پہلے کچھ اور تھا اب اور ہے کچھ
دل کے بجھنے کا سبب اور ہے کچھ

کیا سے کیا ہونے لگی ہے وحشت
دن میں کچھ اور ہے شب اور ہے کچھ

اِس عنایت پہ کہا جائے تو کیا
کہ عطا اور طلب اور ہے کچھ

کیا کہا تُو نے میں کچھ سمجھا نہیں
آنکھ کچھ اور ہے لب اور ہے کچھ

کیفیت دل کی عجب سی ہے امر
کہ تعب اور طرب اور ہے کچھ

امر مہکی

اُونچے گھر کا ہے اُونچا دروازہ
کم ہی کُھلتا ہے ایسا دروازہ

سُرخ دیوار پر ہری بیلیں
درمیاں پھول جیسا دروازہ

کاش ! اِک دوسرے پہ کُھل سکتے
میں ہوں اور تیرے گھر کا دروازہ

کوئی دیوار کیا اُٹھائے گا
دل میں کُھلتا ہے تیرا دروازہ

کسی آہٹ کی منتظر کھڑکی
کسی دستک کا پیاسا دروازہ

کتنے دروازے ہیں گلی میں امر
پھر بھی تنہا ہے اپنا دروازہ

غزلیں

کس کس طرح سے مجھکو ستانا ہے سوچ لے
ہے وقت کم جہان سے جانا ہے سوچ لے

جس کو بجھا کے پھینک رہا ہے بوقتِ صبح
پھر سے اسی دیے کو جلانا ہے سوچ لے

اسکی حدوں سے دور نکلنا فضول ہے
آخر اسی کے پاس ہی آنا ہے سوچ لے

اس کے لیے تو کچھ نہیں صورت گری میاں
کچھ دیر اس نے چاک گھمانا ہے سوچ لے

سوتا ہے میٹرس پہ جو تکیے لگا کے تو
آخر کو ایک اینٹ سرہانہ ہے سوچ لے

دستِ ہنر سے جس کے شفایاب تو ہوا
اس شخص نے ہی زخم لگانا ہے سوچ لے

عطا العزیز

دل کہ آواز لگاتا ہی چلا جاتا ہے
اور پھر سانس کہ آتا ہی چلا جاتا ہے

اک طرف کوئی بجھاتا ہے چراغوں کو مگر
اک طرف کوئی جلاتا ہی چلا جاتا ہے

نیند ایسی ہے کہ آنکھیں نہیں کھلتیں میری
اور فسانہ وہ سناتا ہی چلا جاتا ہے

بستیاں ہیں کہ سبھی غرق ہوئی جاتی ہیں
اور ملہار وہ گاتا ہی چلا جاتا ہے

میں نے جس راہ سے جانا ہو وہاں پہلے سے
کوئی دیوار اٹھاتا ہی چلا جاتا ہے

میں نے دیکھا ہے یہی وہ ہے رحیم اور کریم
مولوی جس سے ڈراتا ہی چلا جاتا ہے

میں کہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہوں اس کی جانب
وہ مری عمر گھٹاتا ہی چلا جاتا ہے

غزل

نقش و تشہیر سے گر مجھ کو عیاں ہونا ہے
اس سے بہتر مجھے بے نام و نشاں ہونا ہے

چھوڑ دے مجھ کو مرے حال پہ اے دوست یونہی
میری قسمت میں تو بس اشک فشاں ہونا ہے

اُس ستم گر کو مرا نام بھی اب یاد نہیں
وہ تو کہتا تھا اسے وردِ زباں ہونا ہے

کل ملاقات کا وعدہ تو کیا ہے اُس نے
انتظار اُس کا مگر مجھ سے کہاں ہونا ہے

آئنہ خانۂ عالَم ہے حوادث کا سجل
ہو چکا ہے وہ سبھی کچھ جو یہاں ہونا ہے

کس قدر شاطر و عیار ہے یہ چرخ بھی یارؔ
جانتا خوب ہے جس جس کو جہاں ہونا ہے

سہیل یار

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رات بھر اُس کی کھڑکی روشن کیوں رہتی تھی
کچھ نہ کہا ہم نے بھی ، جان لیا البتہ

غزل

زاہد محمود زاہد

اگرچہ شام و سحر در بہ در ہوائیں ہیں
کسی چراغ کی زد پر مگر ہوائیں ہیں

یہ آگ بڑھنے سے پہلے ہی روک لو ورنہ
جو شعلہ بھڑکا اِدھر تو اُدھر ہوائیں ہیں

کوئی چراغ ہمیں روشنی نہیں دیتا
براجمان ہر اک بام پر ہوائیں ہیں

تمھاری آنکھ میں جب دھول جھونکتے گزریں
سمجھ میں آئے گا تب بے خبر! ہوائیں ہیں

گلِ حیات کھلا ہے انھی کے ہونے سے
کہ یہ ہوائیں بہت کارگر ہوائیں ہیں

چراغ تو نے جلایا تو ہے مگر زاہد
سفر ہے شام کا اور کم نظر ہوائیں ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھنا یہ ہے کہ ہم کیوں سرِ کہسار آئے
قد بڑھانے اگر آئے ہیں تو بے کار آئے

غزل

مکانِ دل میں کوئی بھی مکیں نہیں مرے دوست
ٹھہر کے دیکھ تجھے گر یقیں نہیں مرے دوست

میں اس لئے بھی تری خیر مانگتا ہوں بہت
تمام شہر میں تجھ سا حسیں نہیں مرے دوست

یہ رفتگاں تو کہیں اور ہی مقیم ہوئے
تلاش کر لے یہ زیرِ زمیں نہیں مرے دوست

وہ کس لئے مرے بارے میں رائے دیتا ہے
جب اس کا ذکر ادب میں کہیں نہیں مرے دوست

جو سچ کے نور سے روشن دکھائی دیتی ہے
مری جبیں ہے یہ تیری جبیں نہیں مرے دوست

میں سر پھرا ہوں، سو اس کے مزاج سے ہوں جدا
کچھ اس لئے بھی میں اس کے قریں نہیں مرے دوست

طارق جاوید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھ تو اے دلِ تیرہ ترے گھر کون آیا
اشک بن کر مری آنکھوں میں اُتر کون آیا

غزل

جو چھوڑتا نہیں ہے ابھی نقشِ پا مرا
اس پر کھلا نہیں کہ ارادہ ہے کیا مرا

ممکن ہے پلٹتا مری سمت آئے وہ
جس کے لیے تڑپتا رہا ناخدا مرا

پھولوں کا رنگ اڑتے زمانے لگیں گے کیا
یہ اک سوال کیسے بنا مسئلہ مرا

عسرت کو ممتحن میں سمجھتا تھا اس لیے
وہ امتحان لیتی رہی بارہا مرا

جو سازشیں ہوئی ہیں مرے گھر سے میں رضاؔ
دیکھوں گا بعد میں تو ابھی سر بچا مرا

نعیم رضا بھٹی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس نے تری آنکھیں، مرے چہرے پہ سجا دیں
کس نے مرے آنسو تری پلکوں پہ جڑے ہیں

غزل

کبھی مشکل کبھی وہ شخص آسانی بناتا ہے
جدھر ہو آگ کا دریا اُدھر پانی بناتا ہے

کوئی تو ہے جو آ کر روز ساحل کی ہتھیلی پر
ترے پاؤں بنا کر اپنی پیشانی بناتا ہے

مصور طیش میں آ کر بڑے زرخیز رنگوں سے
زمیں کی گال پر حیرت سے حیرانی بناتا ہے

ہر اک دوجی غزل میں تذکرہ کر کے ترا جاناں
ترا بے کار خود اپنی پریشانی بناتا ہے

تری قربت میسر ہے مگر پھر بھی یہ دیوانہ
نئے کچھ زاویوں سے روز ویرانی بناتا ہے

اسد رضا سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جذبوں کے بادل لائیں گی یا رُوح بخ کر جائیں گی
کیا جانئے کس سمت سے کیسی ہوائیں آئیں گی

غزلیں

رہا ہی آج میں کتنا ہوں جسم و جان کے ساتھ
چلا گیا ہوں زیادہ تو رفتگان کے ساتھ

یہ اس جہان کو ایسے تو کھینچتا نہیں میں
ملا رہا ہوں اسے دوسرے جہان کے ساتھ

ہماری بات بھی سننے سے کیوں گریز میاں
ہمارے لفظ چپکتے نہیں ہیں کان کے ساتھ

میں مانتا ہوں کہ بھر دے گا وقت تیر کا زخم
مگر جو زخم لگایا گیا زبان کے ساتھ

عزم الحسنین عزمی

فقط تمہیں ہی نہیں دیر سے دکھایا گیا
میں اپنے آپ سے بھی آج تک چھپایا گیا

کسی بھی چیز سے بجھتی نہیں تھی پیاس مری
ہزار بار تو پانی بھی آزمایا گیا

میں ایک عمر تلک نوریوں میں شامل تھا
بدن سے سایہ بہت بعد میں لگایا گیا

تمام عمر بھری قسط پارسائی کی
مکان کب ملا سستے میں لامکان کے ساتھ

تمہارے ہجر کا حل مل نہیں سکا پھر بھی
ہزار گرچہ تعلق تھے آسمان کے ساتھ

حیات بھر مری مانی گئی نہ بات تلک
میں مر گیا تو مرا ایک دن منایا گیا

مجھے دکھائے گئے دائمی سکون کے خواب
عدم سے مجھ کو یہاں ورغلا کے لایا گیا

غزل

وجودِ ذات میں روشن جہان کیسے لگے
مکاں میں رہتے ہوئے لا مکان کیسے لگے

سجا کے آنکھ میں لاشے حسین خوابوں کے
وفا کے لٹتے ہوئے کاروان کیسے لگے

میں ممکنات سے لمحے چرا کے لایا ہوں
جو درد تو نے کیے مجھ کو دان ، کیسے لگے

لطیف وقت تھا جو تیرے ساتھ بیت گیا
جو ٹوٹے ہجر کے پھر آسمان ، کیسے لگے

تجھے کہا تھا: محبت فریب دیتی ہے
سجائے عشق کے دل پر نشان، کیسے لگے

ہوا کے زور سے گر تو گئے درخت، مگر
پرندے پھرتے ہوئے بے امان، کیسے لگے

وفائیں بکنے لگیں زر کے کارخانوں میں
اَنا کے جلتے ہوئے سائبان کیسے لگے

تمھاری یاد ہے، ساجد ہے اور تنہائی
جو تو نے مجھ سے لیے امتحان کیسے لگے

سجاد حسین ساجد

غزل

سبھی پہاڑوں پہ برف پڑنے کے منتظر تھے
اور ایک ہم تھے کہ دل پگھلنے کے منتظر تھے

خنک ہوا پھر لہو کی گردش بڑھا رہی تھی
چراغ پوروں میں پھر سے جلنے کے منتظر تھے

وہ گرم ہاتھوں سے برف پتلے بنا رہی تھی
جو بن چکے تھے وہ پھر بکھرنے کے منتظر تھے

بُریدہ شاخوں پہ سرد ہوتے ہوئے وہ لمحے
کسی کے لہجے سے پھول جھڑنے کے منتظر تھے

وہ بون فائر کے پاس بیٹھی تھی اور شعلے
نمیدہ آنکھوں سے بات کرنے کے منتظر تھے

کسی کی چاہت کشید کر کے سفید گالے
کسی کے مفلر پہ آن گرنے کے منتظر تھے

عاطف جاوید عاطف

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

روز کے روز اک کُنج بسائیں
کاش یہ دُکھ تنکے بن جائیں

غزل

میری خواہش ہے مجھے آج پیادہ نہ پھِرا
خودنمائی کے لیے جادہ بہ جادہ نہ پھِرا

اب کہیں دیکھنے جاتے ہیں نشیلی آنکھیں
اپنے ہاتھوں میں لیے ساغر و بادہ نہ پھِرا

یہ خطرناک علاقہ ہے محبت کے لیے
اپنے ہمراہ مجھے اتنا زیادہ نہ پھِرا

یہ اہانت ہے یہ فتنہ ہے مری بستی میں
اتنی بے باکی سے یہ مولوی زادہ نہ پھِرا

ہر طرف اپنی معیت میں اُسے جانِ اسد
یہ نیا دور نئی دنیا ہے سادہ نہ پھِرا

اسد اعوان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم تجھ سے لڑیں گے تری موجوں کے سہارے
اے بحر! ترے ساتھ ترے پار چلیں گے

غزل

آگ میں جلنے جو ہم نکلے شہاب
بجھ گئے شعلے سبھی اس کے شہاب

زندگی تو تلخ تر اک چیز ہے
دلربا ہیں اس کے بس قصے شہاب

دیکھ کر بیٹھا تجھے غیروں کے ساتھ
لوگ دیتے ہیں مجھے طعنے شہاب

ذات اپنی میں نے خود تعمیر کی
عشق کے ہی اینٹ گارے سے شہاب

وہ رکے جس موڑ پر کہتے ہیں لوگ
سانس لیتے ہیں وہاں لمحے شہاب

سادگی نے درس سب مجھ کو دیے
جا بجا کھاتا رہا دھوکے شہاب

تم ملے تو خود سے بھی ہم مل گئے
ورنہ خود کو ڈھونڈتے رہتے شہاب

شہاب اللہ شہاب

غزلیں

میں جو اِس بار ہَواؤں کی حمایت کرتا
کون جلتی ہُوئی شمعوں کی حفاظت کرتا

شہر کا شہر تھا قاتل کی طرفداری میں
میں کہاں جا کے بھلا اپنی شکایت کرتا

ایک لمحے کی جُدائی بھی قیامت سمجھا
عُمر بھر کے لیے کیوں قطعِ محبت کرتا

اپنا ہی شہر تھا سب لوگ مرے اپنے تھے
دُکھ کی یُورش تھی مگر کیسے میں ہجرت کرتا

اُس نے چھلنی مرے احساس کو کر دینا تھا
کون اُس خارِ مُغیلاں سے محبت کرتا

لوگ اندھے بھی تھے بہرے بھی تھے ورنہ قائل
جی تو کرتا تھا کہ سچ کہنے کی جُرأت کرتا

عمر قیاز قائل

کیوں کسی رام کہانی کی شُروعات کریں
آؤ مل بیٹھ کے اپنی ہی کوئی بات کریں

رات کو دِن تو بنایا گیا ہر بار مگر
آؤ اِس دن کو کسی پَل کے لیے رات کریں

دُوسرا رُخ بھی تو تصویر کا دیکھا جائے
خواب بھی دیکھیں مگر، فکرِ مکافات کریں

شہر کی آب و ہَوا اب نہیں پہلے جیسی
آؤ اُجڑے ہُوئے آباد مضافات کریں

اُگ چکے درد بہت ارضِ سکوں پر قائل
اب ضروری ہے یہاں پیار کی برسات کریں

غزل

مانگ لائے جو زمانے سے ادھارے، اکثر
سارے لمحے تری یادوں میں گزارے اکثر

پھر سے ملنا ہو مقدر میں نہ شاید اب کے
دور جا کر وہ نگاہوں سے پکارے اکثر

وہ محبت گو مکیں ہے مرے دل میں اب تک
جو چمکتے ہیں یہ پلکوں پہ ستارے اکثر

تم بھی کرتے ہو تکلم جو بہاروں سے اب
دل یہ میرا بھی شجر کو ہے پکارے اکثر

اپنی بیٹی کا جنم دن وہ منائے گا کب
بیچتا ہے یہ جو گلیوں میں غبارے اکثر

آفتاب محمود شمس

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ سانس بچ رہے تھے سو وہ سانس بھی لیے
وعدہ خلاف تھے ، سو ترے بعد جی لیے

غزل

کیا ہوا ہے مرا نقصان کہاں سمجھے گا
ہائے وہ زود پشیمان کہاں سمجھے گا

اب رفو گر بھی نہیں اس کو رفو کرنے کا
ہاں مگر چاک گریبان کہاں سمجھے گا

دل کے بہلانے کو دو اشک بھی کافی ہیں مگر
چشمِ گریاں! ترا طوفان کہاں سمجھے گا

میں نے کوشش تو بہت کی ہے مگر جانتا ہوں
تجھ سا بے چین، پریشان کہاں سمجھے گا

اب نہیں لگتی گراں پاؤں کی زنجیر مجھے
میرے زنداں کا نگہبان کہاں سمجھے گا

خالقِ ارض و سماوات کے اپنے دکھ ہیں
یہ معمہ کوئی انسان کہاں سمجھے گا

مجھ سے فرہاد کہا ایک بتِ کافر نے
مسئلہ میرا مسلمان کہاں سمجھے گا

فرہاد ترابی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مری بات کہتے رہنا ، یہ قلم اُٹھائے رکھنا
یہ علَم فرو نہ کرنا ، یہ فلک سجائے رکھنا

غزل

زمانہ بہت خود غرض ہو گیا ہے
ہر اک اپنے بارے میں ہی سوچتا ہے

مفادات کی جنگ سب لڑ رہے ہیں
اور انسان انساں کا دشمن ہُوا ہے

گنہ اک چھپانے کی خاطر یہاں پر
ہر اک کی نگاہ میں گرنا پڑا ہے

قدم لڑکھڑانے لگیں ہیں جو میرے
کوئی تو مرے راستے میں کھڑا ہے

یہ اپنوں کی سب مہربانی ہے ساگر
مجھے آج تک درد جتنا ملا ہے

صدام ساگر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تہِ آسمانِ دنیا ، سرِ خاک دانِ دُنیا
مرے ساتھ ساتھ رہنا، مجھے سائے سائے رکھنا

غزلیں

اتفاقاً مجھے ملا وہ شخص
پھر اچانک بچھڑ گیا وہ شخص

اب مجھے نیند بھی نہیں آتی
شاید اس کو بھی لے گیا وہ شخص

میری باتیں سمجھ نہیں پاتا
کاش ہوتا پڑھا لکھا وہ شخص

خود کو رسوا کیا ہے دانستہ
ایسی پستی میں جا گرا وہ شخص

پیار کرتا تھا دشمنِ جاں سے
جانے اچھا تھا یا بُرا وہ شخص

مجھ کو حق ہے اسے نہ جانے دوں
پھر سے بے سمت چل پڑا وہ شخص

یہ محبت تو اتفاقاً تھی
مجھ پہ جبرانؔ اب کھلا وہ شخص

وسیم جبران

ویرانی سے خوف آتا ہے
دل میں کتنا سناٹا ہے

ناممکن ہے جس سے ملنا
دل بھی ملا تو کس سے ملا ہے

میرے لبوں پر پھول کھلے ہیں
جب بھی تیرا نام لیا ہے

ہاتھ اٹھائے ہوں گے اُس نے
رنگِ شفق یا رنگِ حنا ہے

آفت آکر ٹل جائے گی
ماں کے لب پر حرفِ دعا ہے

اب تک دل میں خلش ہے اس کی
اب تک دل جو کہہ نہ سکا ہے

اب جو جلتا ہے سینے میں
تیری یاد کا وہ شعلہ ہے

جبرانؔ اُس کا ملنا بچھڑنا
کوئی سپنا سا سپنا ہے

غزلیں

ہجر میں رہ کے تماشا نہیں کرنے والا
تجھ سے کچھ اور تقاضا نہیں کرنے والا

مختلف چیزوں کو اُلٹا کبھی سیدھا کر کے
کام کوئی بھی انوکھا نہیں کرنے والا

نیلے پیلے سے زمانے کے سیہ لوگوں کو
تیرا سورج تو سنہرا نہیں کرنے والا

رات ایسی کہ اندھیروں کو چھپا لیتی ہے
دن کا موسم تو اُجالا نہیں کرنے والا

امجد بابر

وہاں سے جو نکلا یہاں آ گیا میں
یہ مجھ کو بتاؤ کہاں آ گیا میں

نہ پوچھو مسافت کے بارے میں کچھ بھی
میں گرتا ، سنبھلتا ، رواں آ گیا میں

یہ تیرے اشارے کنائے پہ ہے سب
ارے جب کہا تو میاں آ گیا میں

مجھے فکرِ دُنیا نے کر ڈالا بوڑھا
مگر اُس گلی سے جواں آ گیا میں

کتنے ہی رنگ بدلتی ہے زمیں کی حرکت
آسماں کوئی دھماکا نہیں کرنے والا

اپنی مرضی سے عطا کر مجھے جو تُو چاہے
تیرا درویش تمنا نہیں کرنے والا

مجھ کو اُمید نہیں اُس پہ یقیں ہے بابر
وہ جو خوابوں کو اُدھورا نہیں کرنے والا

تُو بھی میرے آنے پہ خوش کیوں نہیں ہے
کہ جیسے یہاں ناگہاں آ گیا میں

کوئی رستہ دیوار منزل کی درزیں
خرابے کا در ہے جہاں آ گیا میں

غزل

مری دسترس میں جو پھول تھے وہ جھلس گئے
ترے بعد کوچۂ دلبراں کا یہ حال ہے
مرے بام و در تری خوشبوؤں کو ترس گئے
سرِ رہگزارِ سلوک اہلِ ہوس گئے

مرے خواب زار اجاڑ کے، مجھے مار کے
میں عجیب حالتِ ہجر کے ہوں حصار میں
کہاں خاک اوڑھ کے سو رہے، کہاں بس گئے
نہ تو کھل کے برسیں ہیں بارشیں نہ امس گئے

وہ جو سبز رُت کے سحاب تھے جو گلاب تھے
نہ تو اب وہ کونجوں کی ڈار ہے نہ قطار ہے
مرے دل کی دھرتی پہ آگ بن کے برس گئے
عجب آندھیاں ہیں کہ آشیان و قفس گئے

وہ ترے فقیر کی جھونپڑی ہے یہیں کہیں
وہ بلند بام عمارتیں ، وہ کلس گئے

نصیر بلوچ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

قدم گرفتہ ، مثالِ غبار بیٹھ رہے
بس اُٹھ کے محملِ زرتار دیکھ لیتے ہیں

غزل

نڈر تھے ہم سو بے خوف و خطر آئے
جنوں کی وادیوں سے بھی گزر آئے

تماشا بین پھر بھی خوش نہیں ہم سے
اگرچہ پابجولاں رقص کر آئے

خموشی ہے، سبھی پر خوف طاری ہے
غنیمت ہے کوئی آہٹ اگر آئے

اداسی کو بھی درکار ایک کاندھا تھا
محبت والے اس قابل نظر آئے

کہاں تحقیق کی زحمت گوارا کی
ہجومِ شہر میں محوِ سفر آئے

منڈیروں پر پرندے تک نہیں آتے
وراثت میں ہی ایسے بام و در آئے

مرے آنگن میں ہے اک پیڑ وحشت کا
اسی سال اس پہ ممکن ہے ثمر آئے

تباہی کے دہانے اب خیال آیا
کہاں کرنا پڑاؤ تھا کدھر آئے

جہاں صورت نہ تھی کوئی رسائی کی
وہاں کے خواب ہی بار دگر آئے

حمایت میں بہت آگے گئے احمد
پسندیدہ ہے، وہ جو کچھ بھی کر آئے

احمد محسود

غزل

پھر وہی کرب، وہی دکھ، وہی تنہائی ہے
آخرِ کار وہیں زندگی لے آئی ہے

شدتِ درد سے دل خون ہوا ہے میرا
گھاؤ پہلے تھا جہاں چوٹ وہیں کھائی ہے

تجھ پہ حق ہے نہ تری یاد پہ حق ہے میرا
اجنبی میرے فقط تجھ سے شناسائی ہے

ایسا لگتا ہے ہر اک آنکھ مجھے دیکھتی ہے
ایسا لگتا ہے ہر اک شخص تماشائی ہے

لوٹ آئی ہوں میں پھر عہدِ گزشتہ کی طرف
ان خرابوں سے تو برسوں کی شناسائی ہے

تم بھی ہو ہم سے گریزاں تو کوئی بات نہیں
ہم نے بھی تم سے نہ ملنے کی قسم کھائی ہے

یاد ہے جس میں سحر مات ہوئی تھی مجھ کو
وقت نے پھر سے کہانی وہی دہرائی ہے

نادیہ سحر

غزل

بھاتے رہے کسی کے جوابات دیر تک
ہوتے رہے کسی سے سوالات دیر تک

خوشیوں سے بات چیت رہی صرف چار پل
غم سے رہی ہماری ملاقات دیر تک

کل شب مرے حواس پہ طاری رہا کوئی
آتے رہے کسی کے خیالات دیر تک

چلتی رہے لگن کی پون ہر گھڑی یہاں
مہکے رہیں یہ دل کے مضافات دیر تک

بازیگروں نے کون سی بازی نہیں چلی
لیکن نہ دے سکے وہ ہمیں مات دیر تک

اک درد سا ہماری رگوں میں ٹھہر گیا
ہم کروٹیں بدلتے رہے رات دیر تک

جلتے رہے ہم آتشِ سوزاں میں عمر بھر
کرتے رہے کسی کی مدارات دیر تک

مُدت تلک اُنہیں بھی جھجھک روکتی رہی
آتے رہے ہمیں بھی حجابات دیر تک

ناچیز سی جیاؔ سے بھی الفت کے باب میں
سرزد ہوئے عجیب کمالات دیر تک

جیا قریشی

غزل

چاہت کا دریا تو بہتا رہتا ہے
شہر مگر کیوں پھر بھی پیاسا رہتا ہے

سورج چاند ستارے سارے لے کر بھی
اندھیاروں سے انساں لڑتا رہتا ہے

باہر موسم کیسا بھی ہو کوئی ہمیں
دل کی راہ میں اکثر ملتا رہتا ہے

کس سے اپنے دل کا حال کہیں آخر
چھپ کر وہ تو سب کچھ سنتا رہتا ہے

بے شک بینائی بھی چھن جائے تو کیا
اپنا لکھا ہر کوئی پڑھتا رہتا ہے

محسن تند ہواؤں میں بھی ایک دیا
دریا کے ساحل پر جلتا رہتا ہے

میتھیو محسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مری جاں اُنھیں کون نبیڑے
مری روح میں لاکھ بکھیڑے

غزلیں

عشق اور میری آبرو تُو ہے
شہر میں سب سے خوبرو تو ہے

موت سے ہمکنار ہو جاتا
زندہ رہنے کی جستجو تُو ہے

ذات میری ہے ایک ویرانہ
اور پھر شورِ ہا و ہو تو ہے

میں کہ جس کے ہیں دونوں کان خراب
اور اک میٹھی گفتگو تو ہے

میں کیوں وحشت سے اتنا ڈرتا ہوں
جب یہاں میرے چار سو تُو ہے

زین علی رضوی

کیا سنائیں حیات کا رونا
عشق کی کائنات کا رونا

میری دنیا بدل گیا ہے سب
ہجر کے سانحات کا رونا

بیٹھا ہوں خواب کے مزاروں پر
لے کے میں حادثات کا رونا

تیری تصویر سے مخاطب ہوں
لے کے میں اپنی ذات کا رونا

نعمان حیدر حامی

حسیاتی جمالیات کا شاعر

شاعرِ امروز
نثار محمود تاثیر

شاہد ماکلی

نثار محمود تاثیر کا شعری سفر ذات کی پُراسراریت اور باطنی آثار و احوال کی دریافت کا سفر ہے۔ ان کی مشاہداتی اور تخیلاتی قوت اعلیٰ درجے کی ہے۔ وہ روزمرہ کے عام واقعات سے مضمون کا خمیر اٹھاتے ہیں، انھیں تمثیلی روپ دیتے ہیں، نتیجہ اخذ کرتے ہیں اور یوں ایک عام مشاہدے کی بات کو وہ شعر کے رُتبے تک پہنچا دیتے ہیں، شعر بھی ایسا جو ایک طرف جذبے کی شدت سے معمور ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کی قرات ہمارے خیال کو جمالیاتی سطح پر انگیخت کرتی ہے۔ ان کا لہجہ کہیں تیکھے پن کی بشاشت سے نمود کرتا ہے اور کہیں دھیمے پن کی نشاطیت سے۔ لہجے کا تیکھا پن داخلی اور خارجی عوامل کے ملاپ کا ثمرہ ہے۔ لہجے کا دھیما پن اُس لمحۂ تخلیق میں تشکیل پاتا ہے جب شاعر اپنے باہر کے شور اور اندر کے سناٹے سے اکتا کر کسی کنجِ عافیت میں ستانا چاہتا ہے۔ یہ لہجہ حرفِ زیرِلب کے زیادہ قریب ہے یا کسی سرگوشی کی طرح ہے۔ نثار محمود تاثیر دوسری دہائی میں سامنے آنے والے اہم شعرا میں سے ایک ہیں۔ ان کی غزل معنوی، اسلوبی، تمثیلی، حسیاتی، فکری اور جمالیاتی سطح پر یکساں طور پر ارتقاپذیری کے امکانات رکھتی ہے۔

نثار محمود تاثیر 16 مارچ 1986ء کو میانوالی میں پیدا ہوئے۔ شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز 2015ء سے کیا۔ ذیل میں ان کا نمونۂ کلام:

تماش بین سمجھتے رہے کہ کرتب ہے
چلی گئی تھی حقیقت میں جان مداری کی

ہمارے دستِ گزارش پہ خاک ہی دھر دے
کہ ہم نے لوٹ کے لوگوں کو منہ دکھانا ہے

عجیب لمس ہے اس کا مری ہتھیلی پر
وہ دل بناتی ہے اور دل دھڑکنے لگتا ہے

اور تو عشق میں کچھ خاص نہ کر پائے ہم
جتنا ممکن تھا اضافہ کیا ویرانی میں

یہ مرد کے اشک ہیں سو عورت سے مختلف ہیں
بھنور کا پانی بھنور کے اندر ہی گھومتا ہے

دل ترے نام پہ دھڑکا تھا تو میں بھانپ گیا
اب مرے ہاتھ یہ تیتر نہیں آنے والا

بس اک نگاہ کی سرمایہ کاری کی میں نے
یہ سارا ہجر منافع کی مد میں آیا ہے

حسرتیں دیدۂ پُرآب میں دم توڑ گئیں
پالتو مچھلیاں تالاب میں دم توڑ گئیں

واپس آنے میں کہیں دیر نہ ہو جائے تمہیں
بھوک مر جائے تو کھانا نہیں کھایا جاتا

مانگنے والے نے مانگا ہی نہیں تھا دل سے
ورنہ اک اشک کی دوری پہ خدا ملتا ہے

ہماری آنکھ کو منظر سے بے خبر مت جان
دیے کی لَو کو ہوا کا شعور ہوتا ہے

رائیگانی میں بھی حاصل کی جھلک ہوتی ہے
کچھ نہ ملنے کے نتیجے میں خلا ملتا ہے

خود ہی پھل پھول رہا ہے کوئی جذبہ مجھ میں
جب سے آیا ہوں کسی آنکھ کی نگرانی میں

تمہارے جُوڑے میں ہے، اس لیے سلامت ہے
یہ پھول شاخ پہ پژمردہ ہو گیا ہوتا

رائیگاں جاتا نہیں ہے کبھی زرخیز جمود
پھول کھلتے ہیں فقط ٹھہرے ہوئے پانی میں

میری گہرائی میں دب جاتی ہیں موجیں میری
پُرسکوں سا نظر آتا ہوں میں طغیانی میں

ہمارا دل بھی دھڑکنے پہ ہو گیا مائل
تمھارے چھونے سے پتھر میں جان پڑ گئی ہے

سیر ہوتا ہوں تو بینائی کو ملتا ہے دوام
تیرا چہرہ مری آنکھوں کو غذا جیسا ہے

آنکھ نے سیکھ لیا غم سے تعاون کرنا
پانی اب سطح سے اوپر نہیں آنے والا

اِس بھیڑ میں، جہاں پہ خدا بھی ہے گمشدہ
اک چشمِ التفات کی خواہش فضول ہے

مجھ سے دیوانے صدا کار کا سکتے کے سبب
ایک ہی سمت میں تکنا بھی صدا جیسا ہے

مسلک سے ماورا کوئی مسجد بناؤں گا
جس میں سبھی نمازِ محبت ادا کریں

روایتی سا کہانی میں موڑ آتا ہے
ٹرین رکتی نہیں، ہاتھ چھوٹ جانا ہے

بنایا جاتا اگر ٹہنیوں سے پنجرے کو
قفس میں کچھ تو پرندوں کو آسرا ہوتا

تمہیں لگی ہی نہیں عشق کی ہوا تاثیر
وگرنہ تجھ میں کوئی اور بولتا ہوتا

میں ترے عشق میں اس موڑ پہ آ پہنچا ہوں
جس جگہ دیکھنا بینائی سے مشروط نہیں

ہماری سادہ مزاجی بھی کیا عجب ہے کہ ہم
خوشی ملے تو سبب دوسروں سے پوچھتے ہیں

☆☆☆☆☆

پُورَن ماشی میں
شب بیداری جیسی شاعری

شاعرِ امروز

جاناں ملک

شاہد ماکلی

دوسری دہائی کے ادبی منظرنامے پر کچھ ایسی شاعرات بھی سامنے آئی ہیں جو اعلیٰ درجے کی غزلیں اور نظمیں لکھ رہی ہیں- جاناں ملک انھی جینوئن شاعرات میں سے ایک ہیں- وہ گوشہ نشین ہو کر بڑی سنجیدگی سے اپنے حصے کا کام کر رہی ہیں- آج تک کسی ادبی لابی کا حصہ نہیں بنیں - ہمیشہ اپنی تخلیقیت کی ارتقائیت پر توجہ دی ہے- نہایت اخلاص کے ساتھ نخلِ شعر کی آبیاری کر رہی ہیں- یکساں قادر الکلامی کے ساتھ غزل اور نظم کہتی ہیں- امکانات اور عجائبات کی بھول بھلیّوں کے بھیتر بھیدوں کو کھوجتی ہیں- وہ ایسے نروانی لمحوں کی پُراسراریت میں بیٹھ کر اپنی شاعری قلم بند کرتی ہیں جس کے ایک طرف گھور اندھیرے ہیں، دوسری طرف روشنیاں ہیں- ایک طرف شہر کا شور ہے، ڈھول اور دھوئیں میں اَٹے ہوئے دن رات ہیں، سرپٹ دوڑتی ایک دوسرے کو کچلتی ہوئی پرچھائیاں ہیں- دوسری طرف دیہات کی شانتی ہے، ہرے بھرے کھیتوں کی مہک میں رچی بسی سانجھ سویر ہے، جھاڑ جھنکاڑ چھانٹتے دکھ درد بانٹتے نورانی پیشانیوں والے لوگ ہیں- یمین و یسار میں پنپتی جھڑتی ہوئی یہ دو متضاد فضائیں ہیں--- اور جاناں ملک کی شاعری ان دونوں فضاؤں کے مابین پھیلی ہوئی مسرت اور ملال کی ایکتا سے جنم لیتی ہے- وہ بدلتے ہوئے سماج اور پُرکھوں کے مٹی ہوتے سانچ ڈھانچ پر نیر بہاتی ہیں- نراس کے کڑوے دکھ کو روح پر جھیلتی ہیں اور کڑواہٹ سے آس مٹھاس کشید کر کے جگ سنسار کو دان کر دیتی ہیں- ان کے شبد ان کے لیے مرہم کا کام کرتے ہیں- ان کی کویتائیں ان کے لیے دُھوپیلی دوپہروں میں چھتنار چھایا کا درجہ رکھتی ہیں- ان کی شعری تپسّیا ان کے لیے دھیان گیان کا وہ دروازہ ہے جس سے

داخل ہو کر وہ اپنی ذات، حیات اور کائنات کا عرفان پاتی ہیں۔

وہ 10 اگست 1987ء کو سرگودھا میں پیدا ہوئیں۔ 2015ء سے باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ اردو اور اسلامیات میں ماسٹر کیا ہوا ہے۔ گذشتہ دس برس سے راولپنڈی میں مقیم ہیں۔

ذیل میں ان کی غزلوں سے کچھ منتخب اشعار:

کس کی کھوئی ہوئی ہنسی تھی میں
کس کے ہونٹوں پہ آ گئی تھی میں

کن زمانوں پہ منکشف ہوئی ہوں
کن زمانوں کی روشنی تھی میں

خود کو دریافت کرنے نکلی ہوں
یعنی خود سے کہیں خفی تھی میں

میں نے اک شام پا لیا تھا اُسے
اُس سے اک رات کھو گئی تھی میں

میری پرتیں نہیں کھلیں اب تک
دیوتاؤں کی شاعری تھی میں

خود سے ٹکرا گئی تھی جاناں کہیں
اپنے رستے میں آ گئی تھی میں

کیمرہ وقت کی رفتار دکھاتا ہے مجھے
اب مری عمر سے تصویر بڑی بنتی ہے

اب تو پوروں میں ترے نقش اتر آتے ہیں
اپنی تصویر بناؤں تو تری بنتی ہے

اب تو بھیگی ہوئی آنکھوں میں ترے چہرے کی
کبھی بنتی نہیں تصویر، کبھی بنتی ہے

خواب تھی، اور مجھے دیکھنے والا نہ ملا
عمر تھی اور اندھیروں میں بتائی ہوئی تھی

رنجشیں بڑھتی گئیں اور بھی، کم کرنے سے
درمیاں اس نے وہ دیوار اٹھائی ہوئی تھی

یہ کون لوگ تھے جو درمیاں چلے آئے
ہمارے بیچ تو شاید زمانہ تھا ہی نہیں

کچھ اس لیے بھی سمندر سے دوستی کر لی
مجھے کسی نے کنارے پہ لانا تھا ہی نہیں

میں کس طرح سے گزاروں گی وسعتوں میں اسے
ملی ہے مجھ کو خدا سے حیات مٹھی بھر

وہ میرے ساتھ ہے اور ساتھ بھی کہاں تک ہے
یہ رنگ بنتی ہوئی روشنی کہاں تک ہے

مرا وجود کہاں تک ہے ہم سفر میرا
مرا شعور، مری آگہی کہاں تک ہے

میں نے بادل کو بھیجی تھی
اک کاغذ پر لکھ کر بارش

دن کے ساتھ اتر جاتی ہوں
شام کے پار ٹھہر جاتی ہوں

صحرا جتنی پیاس ہے میری
اور اک بوند سے بھر جاتی ہوں

میاں محمد ! میں تو اپنی
گاگر بھر کے گھر جاتی ہوں

اپنے آپ سے ہاتھ چھڑا کر
میں کن رستوں پر جاتی ہوں

دیکھے دیکھے منظر میں بھی
کچھ اَن دیکھا رہ جاتا ہے

اک لمحے کی تہہ میں رکھا
ایک زمانہ رہ جاتا ہے

لوگ تو پار اتر جاتے ہیں
دریا دیکھتا رہ جاتا ہے

ایک مسافر اور دو منظر
گھر سے کالج ، کالج سے گھر

دروازے پر پہلی دستک
پیڑ تک آیا پہلا پتھر

دونوں جانب خاموشی ہے
دیواروں کے اندر باہر

کون یہ میرے ساتھ تھا جاناں
چونک اٹھی ہوں چپ ہونے پر

مجھے خبر ہے، وہ میرا محرم نہیں ہے جاناں
میں سوچتی ہوں اسے، جسے سوچنا غلط ہے

بات کرتے ہو تم کون سے عشق کی
دل لگی دل لگی دل لگی رہ گئی

ایک دکھ گھر کے اندر تلک آ گیا
کوئی کھڑکی کہیں ادھ کھلی رہ گئی

کیا بتلاؤں کیسے کیسے طوفانوں سے گزری
میں کاغذ کی کشتی تھی اور دریا پار کیا

ایک دنیا کا سفر ہے اس کے میرے درمیاں
فاصلے ہی فاصلے ہیں، ناپتی رہتی ہوں میں

کیسا بادل ہے، لپٹ جاتا ہے مجھ سے خواب میں
کیسی بارش ہے کہ شب بھر بھیگتی رہتی ہوں میں

گم شدہ اک شہر کا اب تک پتہ ملتا نہیں
شام ہو جاتی ہے، گھر کا راستہ ملتا نہیں

ایک محل تھا راجہ کا، اک راج کماری ہوتی تھی
اُس راجہ کو اپنی پرجا جان سے پیاری ہوتی تھی

بابا کہتے ، یہ جو کھنڈر ہے سیتا رام کا مندر تھا
اِس مندر کی ایک پجارن رام دلاری ہوتی تھی

ایک دیے کی لَو میں بابا میر اور غالب پڑھتے تھے
ایک انگیٹھی ہوتی تھی اور ایک الماری ہوتی تھی

ایک کنواں میٹھے پانی کا اور اک بوڑھا برگد تھا
ایک محبت کا گہوارہ بستی ساری ہوتی تھی

میٹھے گیتوں کی وہ رسنا، میٹھی دُھن اور میٹھے بول
پورن ماشی پر آنگن میں شب بیداری ہوتی تھی

اب جو ملّا وعظ کرے تو خوف سا آنے لگتا ہے
موہَن داس سے نعتیں سن کر رقّت طاری ہوتی تھی

رشتوں کا احساس لہو کے اندر رچتا بستا تھا
کب ایسی نفسا نفسی اور مارا ماری ہوتی تھی

تیز ہوا کے جھونکے شب بھر ٹکراتے ہیں پیڑوں سے
کتنے پتّے آنسو بن کر گرتے ہیں ان شاخوں سے

دیواروں سے اکتاؤں تو دھیان بٹانا پڑتا ہے
خوش ہوتی ہوں باتیں کر کے گلی میں کھیلتے بچوں سے

روشن دان کھلا رکھتی ہوں کمرے کا
صبح پرندوں کی آوازیں آتی ہیں

ہر پل تیرے ساتھ تھی، میں کب دور رہی
میں خوشبو تھی، اور تیرے احساس میں تھی

ایسا نہیں کہ ہجر گوارا نہیں ترا
میں اپنی ناتمام اداسی سے تنگ ہوں

اس کا اک نام ہے محبت بھی
اور وہ نام بھی صفاتی ہے

جب ہنسی ٹوٹ پھوٹ جائے تو
بے بسی تالیاں بجاتی ہے

زہر ہی زہر کا تریاق ہوا
دکھ میں بھی میرا سہارا دکھ ہے

آگہی ایسا سفر ہے جس کا
فائدہ دکھ ہے، خسارا دکھ ہے

کوئی اندر سے خالی کر گیا ہے
مرے دل کو کمی سے بھر گیا ہے

یہاں اک اور دنیا لکھ رہی ہے
کسی اک اور دنیا کی کہانی

بلندی سے گری خوابوں میں اکثر
پڑھی تھی کوہ پیما کی کہانی

رنج میں کچھ کمی تو کی ہم نے
دیکھیے شاعری تو کی ہم نے

جل بجھے ہیں ، یہی مقدر تھا
دو گھڑی روشنی تو کی ہم نے

☆☆☆☆☆

کرسی اور گدھا

ذرا سی مشابہت پر کدو کو تربوز اور کرکس کو ولی ثابت کیا جانا مشکل نہیں تو گدھے اور کرسی میں بھی قدر مشترک یعنی چار ٹانگیں موجود ہیں۔ یہ مماثلت نظر انداز کرنے کے قابل نہیں یعنی بازی گر کھلا دھوکہ دے سکتے ہیں۔ یوں بظاہر تو اپوزیشن اور حکومتی کرسیوں کا زاویہ بھی بالکل الٹ دکھائی دیتا ہے اگرچہ بباطن اور درون خانہ ان کے رابطے صمد بانڈ سے بھی زیادہ مضبوط اور دیرپا ہوتے ہیں۔ بنیاد میں لکڑی جو بھی استعمال کی جائے، مفادات کے لیے شیر و شکر نظر آتی ہیں۔ کرسی یا گدی نشین ہونے کے لیے قوم کو گدھا تصور کر کے آنکھوں میں دھول جھونکنا ضروری عمل ہے۔ کرامات کی یہ دھول چاٹتے گدھا بیگار میں عمر گزار دیتا ہے۔ بجٹ کی خوش فہمیاں گدھے کی صحت پر اچھا اثر ڈالتی ہیں اور اس کی زندگی ''نہ پاپ، نہ پن، بیانات پہ سر دھن'' کی صورت ناچتی رہتی ہے۔ کرسی کے لیے لڑے جانے والے الیکشن میں کروڑوں خرچ کرنے کا مقصد گدھے کو مزید گدھا بنانا ہے۔ اس مقصد کے لیے گدھے کی آرتی اتار کر مالا کرسی کو ہی پہنائی جاتی ہے۔ کرسی پر بیٹھنے کے لیے ایک ٹانگ پر کھڑا ہونے والے جیت کے بعد پانچ سال تک گدھے کو دولتیاں مار مار کر یہ یقین دلاتے ہیں کہ اصل گدھا وہی ہے اور ضروریات کے کارڈ وصولنے کے لیے اسے ہی قطار میں کھڑا ہونا ہے۔ کرسی کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں اب مماثلت کا یہ کیا جواز کہ گدھے کی بھی تو چار ٹانگیں ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں جتنی بھی سازشیں ہوئی ہیں وہ کرسی کے لیے کی گئیں گدھے کے لیے کون سازش کرتا اور اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ گدھا نہ محبوب ہو سکتا ہے نہ رقیب، نہ طبیب اور نہ ہی حبیب۔ گدھے کی زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے اس پر صرف بوجھ ڈھویا جاتا ہے۔ کرسی کی خاطر تو لوگ کپڑے تک اتار کر کھڑا ہونے کو تیار ہیں۔ کرسی کے لیے

سعدیہ بشیر

کتنے ہی لالچ دیئے جاتے ہیں۔ کرسی کو پالش کروا کر۔ نت نئے کور، ڈیزائن اور رنگ کی تبدیلی سے اسے مزید مضبوط بنایا جاتا ہے جبکہ گدھے کا رنگ یا نسل جو بھی ہو، اس کی زندگی کتے سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ عمر درازی کے دن چار ہوں یا چار سو اس کی زندگی کرسی کی ناز برداری میں ہی گزر جاتی ہے کوئی اس کی سوئی ہوئی دم نہیں ہلا سکتا۔ کرسیاں مضبوط رکھنے کے لیے اس پر اتنا بوجھ لادا جاتا ہے کہ وہ غیرت و خودداری کا بوجھ نہیں ڈھو سکتا۔ instant قانون سازی کرسی کے لیے کی جاتی ہے، توقیر کرسی کی ہوتی ہے، انصاف کرسی کو ملتا ہے۔ البتہ انصاف کو ذبح کرنے کے لیے برقی کرسی ضرور استعمال کی جاتی ہے۔ گدھوں پر صرف ٹیکس سازی کی جاتی ہے۔ منی بجٹ اور اسپیشل منی بجٹ کے نام پر اتنا بوجھ لادا جاتا ہے جو سات نسلوں تک سفر کرتا ہے۔ اسے اس بوجھ کو ڈھوتے ہوئے مرنے کی اجازت تو مل جاتی ہے لیکن گرنے کی قطعی اجازت نہیں ملتی اور اسے بدشگونی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ الاونس کے خوش آئند لالی پاپ میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ گدھے کی کمزوری رفع کر سکے۔

کرسی کی پہنچ بڑی دور تک ہے۔ ''پیسے کو پیسہ کھینچے ہے کر کر لمبے ہاتھ'' کی طرح کرسی کو بھی کرسی کھینچتی ہے۔ جب کہ گدھے نم آنکھوں سے ایک دوسرے کے بوجھ کو دیکھتے ہیں اور ہر بار نظر چرا لیتے ہیں۔ گدھے کی دن رات کی جگالی ان کمیٹیوں کی طرح بے سود رہتی ہے جو نکلنے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتی ہیں یا پھر ایسی فاقوں کی طرح جن پر بندھا سرخ فیتہ زندگی بھر نہیں کھلتا۔ گدھے اگر کرسی پر بیٹھ جائیں تو کرسی کی جگالی بھونڈے بیانات اگلتی ہے۔ یہ بیانات ہی ہیں جن سے یقین ہوتا ہے کہ کس کرسی پر گدھا بیٹھا ہے اور کرسی کی طاقت کا سہارا لے کر وہ اپنے حصے کا بوجھ ڈھونے سے انکاری ہے۔ سر پیر سے عاری ڈھینچوں ڈھینچوں کے بیانات تازیانے سے زیادہ اذیت ناک ہیں۔ اتحاد کی برکت سے نابلد گدھوں کا بیانیہ کبھی ایک نہیں ہوتا۔ چالاک کرسی ان کا بیانیہ تقسیم کروا دیتی ہے۔ جب کہ کرسی کا بیانیہ صدیوں سے ایک ہی ہے... یعنی اپنی حفاظت۔

عجائب گھروں میں گدھے کا مجسمہ نہیں رکھا جاتا۔ گدھے میں مجسمہ بننے کی اہلیت ہی نہیں۔ ہاں مگر جن کا منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھایا جانا چاہیے۔ الفاظ اور ہیش ٹیگ کی صورت، اندھی عقیدت کے مجسمے بنا کر سوشل میڈیا پر ان کی پوجا کروائی جاتی ہے۔ کرسی نشین خود ہی اپنے مجسمے بنانے کے اتنے ماہر ہو چکے ہیں کہ مجسمہ سازوں کی دکانیں بند ہو گئی ہیں۔ وہ اپنے اوزار لیے

چپ چاپ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ ایسی کتنی ہی پر ابہام تصاویر بھی جاری کی جاتی ہیں جن میں نام نہ ہونے سے کرسی پر بھی گدھے کا ہی گمان گزرتا ہے۔ صرف مماثلت سے گدھے اور کرسی کو پیر بھائی نہیں بنایا جا سکتا۔

گدھے کے صرف پاؤں ہوتے ہیں اسی لیے وہ اب تک گدھا ہے جبکہ کرسی کے دو ہاتھ بھی ہوتے ہیں جسے کرسی کے بازو کہا جاتا ہے۔ یہ بازو بہت مضبوط اور لمبے ہوتے ہیں۔ کئی کرسیاں ایسی بھی ہیں جن کا صرف ایک ہاتھ ہے لیکن یہ ایک ہاتھ بھی بہت بھاری ہے۔ کرسی کا یہ ہاتھ کرسی نشیں کو تقویت دیتا ہے کہ وہ کرسی کا مالک ہے۔

کرسی کے اس ہاتھ اور بازو پر کتنے ہی محاورے بھی بنائے گئے ہیں۔ مثلاً

ہاتھ گناہ کرے گا، لیکن سر جواب دے گا۔

جس چیز میں روح جھوٹ بولتی ہے، اس کے ساتھ ہاتھ جوڑ جائیں گے۔

ہاتھوں کی قیمت آستین کے لیے نہیں بلکہ کاروبار کے لیے ہے۔

بازو لمبے ہیں (ایک اور ورژن کے مطابق، بال لمبے ہیں)، اور دماغ چھوٹا ہے۔

کرسی کے ہاتھوں میں لکیریں نہیں ہوتیں لیکن کرسی پر بیٹھنے والا دوسروں کی لکیریں لکھنے مٹانے میں لگا رہتا ہے تاوقتیکہ وقت اس پر لکیر نہ پھیر دے۔ اگر کبھی کوئی گدھا کسی بڑی کرسی پر بیٹھ جائے تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ گھبرائے بغیر سب خود بخود گدھا بن جائیں۔

گدھے کی طاقت اس کی ناطاقتی ہے جبکہ کرسی کی اصل طاقت اس کی پشت یا بیک ہوتی ہے۔ یہ پشت خار پشت سے مشابہ ہوتی ہے۔ بھلے گدھا لوٹا کہے یا سیلیکڈ، لیکن کوئی مائی کا لال کرسی کو ہلا نہیں سکتا۔ اس میں خار پشت کا کافی دخل ہے۔ گدھے کی پشت پر بھی گدھا ہی ہوتا ہے۔ تجربات سے معلوم ہوا کہ جس کرسی کی پشت مضبوط ہو وہی جیتنے کی صلاحیت رکھتی ہے بالفاظ دیگر اسے یہ صلاحیت فراہم کی جاتی ہے۔ اپنے وزن سے زیادہ بوجھ لادے گدھے اکثر گر جاتے ہیں لیکن طوعاً کرہاً پھر سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ رینگ رینگ کر زندگی جینے والے یہ گدھے کبھی کسی کرسی نہیں بیٹھ سکتے۔ البتہ ناپے ہوئے چال کے لیے گدھا کسی ریس ہارس سے بھی تیز دوڑنے کے قابل ہے۔ دراصل گدھے کی پشت پر لومڑی ہی اس کا وزن طے کر کے اسے گدھا رہنے پر اُکساتی ہے۔ یہ لومڑی ہی ہے جو فلسفیانہ موشگافیوں سے کرسی کو گدھا اور گدھے کو کرسی پر بٹھا کر پیروقت ثابت کر سکتی ہے، جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

رہے نام اللہ کا

☆☆☆☆☆☆

دادا، دلدادہ

کہتے تو انھیں سب دادا تھے مگر ان کا اصل نام مستقیم تھا سب کو سیدھے راستے پر چلنے کی تلقین کیا کرتے اور خود بھی ذائقہ بدلنے کے لیے مذکورہ راستے پر چل لیتے تھے مگر دشواری کی وجہ سے پھر پرانی ڈگر پر آ جاتے تھے پیشہ پہلوانی تھا مگر جیتنے کی حد تک مطلب یہ کہ خوش قسمتی سے اگر کسی کشتی میں جیت جاتے تو سو پشتیں تک پہلوانی میں ملوث ہو جاتیں اور ہار جاتے (ایسا اکثر ہوتا تھا) تو اپنے مداحوں کے سامنے روہانسے ہو کر اقرار کر لیا کرتے کہ میں کوئی خاندانی پہلوان تھوڑا ہی ہوں۔

اس رٹے رٹائے فقرے کے بعد انتہائی شکستہ لہجے میں یہ شعر پڑھ کر سارا عذاب مقدر پر ڈال دیتے تھے۔

شکست و فتح مقدر سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

.....

جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے کہ دادا کا پیشہ پہلوانی تھا اور اس فن کا جملہ قواعد و ضوابط سمجھتے بھی تھے مگر اکثر ان سے کھلا انحراف بھی کر جاتے۔ مطلب یہ کہ اکھاڑے سے باہر جو بھی پہلوانی جھاڑتا اسے عجز و انکسار سے سمجھاتے اگر سمجھ میں آ گئی تو ٹھیک ورنہ اسے عجز و انکسار کے تاثرات بدلے بغیر پلک جھپکتے ہی پچھاڑ دیا کرتے تھے اور ایسا کبھی نہیں ہوا کے کوئی شخص ان سے دھوبی پٹک کھانے کے دو بعد گھنٹے سے پہلے اُٹھنے کے قابل ہوا ہو۔ اسی حربے کی بدولت اپنے کٹر دشمنوں اور قصابوں میں یکساں مقبول تھے کیونکہ دادا کے ہوتے ہوئے موٹی تازی گائے یا بھینس کو پچھاڑنے کے لیے تین چار آدمیوں کی مدد نہیں لینی پڑتی تھی۔ بھاری سے بھاری جانور پر اکیلے بھاری پڑتے تھے۔ بلکہ بعض مرتبہ تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ جانور ان کا ڈیل ڈول دیکھ کر ہی بہ رضا و رغبت ڈھیر ہو جاتا تھا۔

بقول دادا کے غذا بہت ہی خفیف تھی۔ دو کلو گوشت کی یخنی علی الصبح بغیر ڈکار لیے پی لیا کرتے تھے۔ ناشتے میں ڈھائی کلو بھنا گوشت، روٹی کے بغیر نوشِ جاں کرتے مگر اس میں یہ رعایت کرتے کہ ایک نابالغ بچے کی غذا جتنا گوشت چھوڑ دیا کرتے جسے گنجائش رکھ کر کھانا کہتے تھے اور یہ اس لیے بھی ضروری تھی کہ ناشتے کے بعد دو کلو وزن کا گوشت روٹی کے ساتھ کھانا پڑتا تھا جسے دوپہر کے کھانے کی پہلی قسط کہتے پھر دوسری اور تیسری، یہاں تک کہ رات کے کھانے کی پہلی قسط کا وقت ہو جاتا اور توازن برورار رکھنے کے لیے وہ بھی تین قسطوں میں کھایا جاتا اس طرح روزانہ چھ مرتبہ کھانا کھاتے غرض یہ کہ جس قصاب کی پہلے ایک بلڈنگ تھی اس نے اب

مرزا عاصی اختر

چار کر لی تھیں اب رہ گئے فروٹ تو دن میں ایک پیٹی سیب اور دیگر رائج الوقت فروٹ زہر مار کرتے۔ انار کے شوقین تھے۔ ایک پیٹی ہوتی تو رغبت سے شروع کرتے اور تعداد درجنوں میں یعنی قلیل ہوتی تو اسکا بھی گزارا کر لیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ڈرائی فروٹ بھی استعمال کرتے تھے۔ چلغوزے شوق سے کھاتے مگر مونگ پھلی کو سونگھنے کے بھی روادار نہیں تھے اور اس کی وجہ فخریہ یہ بتاتے کہ جسے عام لوگ کھاتے ہوں اسے خواص کس طرح کھا سکتے ہیں۔ اللہ جانے پانی کس طرح پیتے ہونگے۔

پہلوانی کے ساتھ دادا کو سخن وری کا بھی دعویٰ تھا۔ شعروں میں وزن کے قائل نہ تھے اور اس کی یہ انوکھی توجیح پیش کرتے کہ ہمارا اپنا وزن کم ہے جو شعروں میں بھی اس کا اہتمام کریں۔ اپنے علاوہ استاد امام بخش ناسخ کو بھی طوعاً کرہاً شاعر مان لیتے تھے۔ وہ بھی اس بنا پر کہ انھوں نے شاعری کے علاوہ پہلوانی کے کوچے میں بھی قدم رکھ لیا تھا۔ مگر پہلوانی میں اپنے علاوہ کسی کو شمار نہیں کرتے تھے۔ ناسخ کو بھی نہیں۔ دادا اپنا سلسلہ پہلوانی قدیم رومن پہلوانوں سے ملا کر بہت خوش ہوتے اور حاضرین بھی اس بے پر کی گفتگو سے بہت محظوظ ہوتے۔ جیسا اوپر ذکر آچکا ہے کہ دادا شعر میں وزن کے قائل نہیں تھے۔ ہر چند کہ انکا شعر بے وزن ہوتا مگر ہر شعر میں کشتی کے داؤ پیچ کا ایسا سماں باندھتے کہ سامع کا دھیان وزن سے ہٹ کر داؤ پیچ کی جانب مبذول ہو جاتا تھا اور اگر کچھ نووارد پہلوان شاعر داد دینے میں کوتاہی کرتے تو شعر میں تلقین کیے گئے داؤ پیچ کا عملی مظاہرہ برسرِ مجلس بھی ہو جاتا لیکن کسی کی مجال نہ تھے کہ اس محفل کو مشاعرے کے علاوہ کسی اور نام سے پکارتے۔

زندگی کے آخری ایام میں جب پہلوانی کا یارانہ رہا تو راج مستری کا پیشہ اختیار کر لیا اور خاصے دنوں تک لوگوں کی جیبوں پر راج کرتے رہے۔ تبدیلی پیشہ کی وجہ مداحوں اور شاگردوں کو یہ بتاتے کہ اینٹ اٹھانے سے کمر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ورزش کی ورزش اور پھر یہ کہ اکھاڑے تک آنے جانے کا وقت بچ جاتا ہے۔ جن جن لوگوں کے مکانات بنائے ان کو ہمیشہ کے لیے اپنا اسیر کر لیا وہ اس طرح کہ دہاڑی دینے میں دیر سویر ہو جاتی تو مالک مکان کو ہلکا پھلکا زور کرا دیا کرتے تھے۔ اس طرح کئی حضرات کو پہلوانی کا ابتدائی سبق دے کر اس فن کی طرف راغب کر دیا تاکہ فن کے حوالے سے لاوارث نہ مریں۔

عام طور پر سیمنٹ بجری اور دیگر چیزوں کے لیے صاحبِ خانہ کو زحمت نہیں دیتے تھے۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں بے فکری سے چلے جاتے۔ حساب میں انھوں نے کبھی گڑبڑ نہیں کی۔ ایک ایک پائی کا حساب دیا کرتے تھے۔ ہاں بازار میں کسی چیز پر طبیعت لوٹ جاتی تو صاحب خانہ کے خرچ پر کھا لیتے۔ ایسے مواقع پر ذوق کا یہ عالم تھا کہ حقیر اور معمولی چیزوں کی طرف نگاہ اٹھتی ہی نہ تھی، سوائے اس وقت جب کہ اپنی جیب سے کھا رہے ہوتے، ہاں صاحب خانہ کے خرچ پر تو چرغہ،

مرغ مسلم اور مرغ بریانی پر دانت بلکہ پوری مصنوعی بتیسی رکھتے تھے۔ ایمان دار اتنے کہ آکر بابانگ دہل بتا دیا کرتے تھے۔ کبھی کوئی پوچھتا کہ آپ اتنے دیانت دار کب سے ہو گئے تو چوتھی کلاس کے زمانے کا وہ سبق بنیاد بتاتے جس کا عنوان تھا "درخت میں نے کاٹا ہے"۔ اور کہتے تھے کہ "میں اسی زمانے سے برابر سچ بولے چلا جا رہا ہوں"۔ کئی حضرات تو عالم انکساری میں یہاں تک کہتے کہ "بڑی خوشی ہوتی ہے جب ہمیں اپنا کہتے ہیں" (حالانکہ یہ جملہ کہتے ہوئے صاحب خانہ کے لہجے میں بلا کر درد اُمڈ آتا تھا) مگر ایسا بھی کیا کبھی کبھار اتنی چیزوں میں ہمارے بچوں کے لیے بھی لے آیا کریں یہ تراخ سے جواب دیتے "واہ صاحب کیا خوب کہی کیا ہمارے بچے نہیں ہیں۔ یہ تو تھا موصوف کی قوت جسمانی، قوت لسانی اور قوت اخلاق کا ذکر، رہ گئی قوت ارادی تو وہ بھی بلا کی مضبوط تھی۔

ایک مرتبہ دوسری منزل پر چنائی کر رہے تھے کہ پاؤں پھسلا اور دھڑام سے سڑک پر آگرے۔ پہلوانی ڈیل ڈول کی وجہ سے محسوس ہوا کہ جیسے چھت گری ہے۔ جن لوگوں نے گرتے ہوئے دیکھا تھا سب یہی کہہ رہے تھے کہ یہ آواز کسی انسان کے گرنے سے پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ مگر دادا کو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں وہ بڑے اطمینان سے کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھے اور مجمع کو حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن چھوڑ کر دوبارہ دوسری منزل پر پہنچے اور اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

اکثر پہلوان ریٹائرمنٹ کے بعد دوسرا پیشہ اختیار کر لیا کرتے ہیں کچھ نہیں تو نو واردوں کو اکھاڑے میں زور ہی کراتے ہیں۔ چونکہ ان کا پیشہ راج مستری کا تھا اس لیے جب راج مستری کا کام بھی بد سے باہر ہو گیا اور اینٹ نے دونوں ہاتھوں سے اٹھنے سے انکار کر دیا اور عضاء جوارح بالکل جواب دینے لگے، بس قوت ارادی رہ گئی تو محض اس کی بدولت انھوں نے تیسرا پیشہ اختیار کر لیا۔ سیمنٹ کی دو ہائی دو کی سلیب کو (جو سرکاری پائپ لائن سے ان کا برادر نسبتی نکال لایا تھا)۔ چونے سے پوت کر براق کر لیا تھا اور اس پر انتہائی شکستہ خط میں کوئلے سے بقلم خود یہ تحریر لکھ دی کہ "ہمارے ہاں ٹوٹی ہڈی اور جنانہ مردانہ موچ کا الاج تسلی بخش کیا جاتا ہے"۔ مگر بیں دنوں تک دکان پر کوئی گاہک نہیں آیا سوائے زمانہ پہلوانی اور راج گیری کے شاگردوں کے تو ان کی اہلیہ نے پردے کی اوٹ سے توجہ دلائی کہ ان بیں دنوں میں پانچ سو، شاگردوں کی ناز برداریوں میں ٹھنڈے ہوئے اب کل کے لیے شکر پتی نام کو نہیں۔ یہ دھیمی دھیمی گفتگو کسی شاگرد نے بھی سن لی۔ اس نے اسی وقت استاد سے اجازت لی اور رخصت ہوا، بارے شاگردوں کے جھگمٹے کم ہوئے تو مریضوں نے بھی آنا شروع کیا۔ اب ہوتا یہ تھا کہ روزانہ چار پانچ کیس ہڈی ٹوٹنے کے آنے لگے۔ مگر زیادہ حیرت ناک یہ بات ہوئی کہ جتنے کیس آتے اتنے ہی شاگردوں کی ضمانت دادا کو تھانے سے کرانا پڑتی۔

☆☆☆☆☆

''پاکستانی ادب کے معمار'' پروفیسر جلیل عالی

جلیل عالی زبان و بیان اور اسلوب تازہ کے ساتھ عمیق مشاہدات، نازک احساسات، تلخ و شیریں تجربات اور شدتِ جذبات کو شعری قالب میں ڈھالنے پر مکمل دسترس رکھتے ہیں۔ وہ شعری آہنگ میں انفرادیت کے حامل ہیں اور اپنے ہم عصر شعرا میں منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے زیرِ اہتمام ''پاکستانی ادب کے معمار'' سیریز کے تحت پروفیسر جلیل عالی کی شخصیت اور فن پر زیرِ نظر کتاب خاور اعجاز کی علمی و تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو یقیناً عالی صاحب کے فن کو سمجھنے میں ایک بنیادی وسیلے کی حیثیت رکھتی ہے۔ خاور اعجاز خود بھی ایک باکمال شخصیت کے مالک اور عمدہ شاعر و نثر نگار ہیں جو ادب پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں جن کی پروفیسر جلیل عالی کے ساتھ قربت بہت دیرینہ ہے۔

جلیل عالی کا تعلق ارائیں برادری سے ہے ان کے آباواجداد کا پیشہ بھی زمینداری تھا۔ قیامِ پاکستان کے وقت وہ اپنے خاندان کے ہمراہ ہجرت کی مشکلات جھیلتے ہوئے براستہ لاہور سے گوجرانوالہ کے ایک گاؤں چھچھر والی میں قیام پذیر ہوئے۔ ان کی پیدائش ہندوستان کے ایک قصبہ ''ویروکے'' میں ہوئی۔ انہیں زمانہ طالبِ علمی سے ہی فلم دیکھنے اور دریائے راوی پر کشتی کی سواری بہت پسند تھی۔ تاہم دورانِ تعلیم فلم بینی کے ساتھ ساتھ انہیں لکھنے کا شوق بھی پیدا ہوا اور

صدام ساگر

انھوں نے ''اور مطلع صاف ہو چکا تھا'' کے عنوان سے اپنا پہلا افسانہ تحریر کیا جو نہ صرف کالج میگزین ''کریسنٹ'' میں شائع ہوا بلکہ کچھ عرصہ بعد انٹرمیڈیٹ سطح کی اردو گرامر کی ایک کتاب میں افسانے کی صنف کے نمونے کے طور پر بھی درج ہُوا۔ انھوں نے کوٹ شیر سنگھ نامی ایک گاؤں کے ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی اسکول سے میٹرک، اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ سے ایف اے جبکہ ضمنی امتحان پاس کرنے سے تاخیر ہو جانے کے باعث بی اے کے لیے ایم او کالج لاہور میں داخلہ لینا پڑا۔ جہاں فلسفہ اور اردو کے ساتھ فارسی کے مضامین اختیار کیے۔ یہاں انہیں نصابی معروفیات کے علاوہ غیر نصابی سرگرمیوں کا موقع بھی میسر آیا۔ ۱۹۶۴ء میں انہیں کالج میگزین ''شفق'' کا سٹوڈنٹ ایڈیٹر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہُوا۔ ۱۹۶۵ء میں بی اے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے اُردو کا داخلہ لیا۔ جہاں ان کے اساتذہ میں سید وقار عظیم، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور ڈاکٹر معین الرحمان جیسے جید سکالرز شامل تھے۔ عطا الحق قاسمی، رفیع الدین ہاشمی اور قیوم نظامی ایک سال سینئر اور امجد اسلام امجد اور راشد حسن رانا جیسے ذہین طالب علم ہم جماعت تھے۔ ۱۹۶۷ء میں پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے سوشیالوجی میں داخلہ لیا۔ جہاں وہ یونیورسٹی میگزین ''محور'' کے طالب علم مدیر رہنے کے علاوہ شعبہ سوشیالوجی میں سمپوزیم کمیٹی کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ ان کی باقاعدہ عملی زندگی کا آغاز اُردو کے لیکچرار کی حیثیت سے ہُوا۔ انہوں نے اپنی باقاعدہ عملی زندگی کا آغاز ۶۸ ستمبر ۱۹۷۰ء کو بحیثیت لیکچرار اُردو، بی بی کالج برائے طلباء واہ کینٹ سے کیا۔ اس حوالے سے خاور اعجاز بہت دلچسپ واقعہ سناتے ہیں کہ (از مختصر) ''یہ واحد آسامی تھی جس کے لیے کوئی نوے کے قریب اُمیدوار آئے ہوئے تھے جن میں معروف شاعر حسن رضوی بھی شامل تھے۔ حسن رضوی کا کہنا تھا کہ اُن کی بات ہو چکی ہوئی ہے اور وہ یہاں یقیناً منتخب ہو جائیں گے۔ جب بارہ ایک بجے تک جلیل عالی کی باری نہ آئی تو وہ واپسی کے لیے بس سٹاپ پر آ گئے۔ مگر حسن رضوی اُنہیں کھینچ کر لے گئے کہ چلو ایک تجربہ ہی سہی ویسے تو مَیں یہاں منتخب ہُوا ہُوا ہُوں۔ تاہم جب تین

ساڑھے تین بجے جلیل عالی کی باری آئی تو انٹرویو میں شامل ایگزیکٹو آفیسر نے پوچھا کہ کیا وہ وہی جلیل عالی ہیں جو ''فنون'' میں چھپتے ہیں؟ عالی صاحب کے اثبات پر اُنہوں نے کہا کہ پھر غزلیں سنائیں۔ یوں یہ انٹرویو چند غزلوں کی سماعت اور غالب پر گفتگو تک محدود رہا اور اسی پر جلیل عالی کا انتخاب ہو گیا۔''

عالی صاحب کو جب بعد میں معلوم ہُوا کہ انٹرویو لینے والے شاعر جمیل یوسف تھے جن سے اسلم کمال ان کا پہلے ہی ذکر کر چکے تھے۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ ایف۔ جی سرسید کالج راولپنڈی میں ہو گیا۔ یہاں جمیل ملک شعبہ اردو کے صدر تھے۔ اس کالج میں اُن کے دیگر ساتھیوں میں عرفان صدیقی کے علاوہ ڈاکٹر رشید امجد، مشتاق قمر اور محمود کنور بھی تھے۔ جمیل ملک کی ریٹائرمنٹ پر ڈاکٹر رشید امجد شعبہ اردو کے صدر مقرر ہوئے اور پھر یہ منصب جلیل عالی کے حصے میں آیا۔ اس دوران انہوں نے اس کالج کے زیر اہتمام ڈاکٹر رشید امجد کے ساتھ مل کر ''پاکستانی ادب'' کی سات جلدیں ترتیب دیں جو ایک قابلِ ذکر ادبی کام ہے۔ شخصی طور کے اعتبار سے جلیل عالی کی تین چار واضح شناختیں بنتی ہیں۔ جس کا بخوبی جائزہ خاور اعجاز نے اپنی تحقیق و تنقید کے دوران لیا ہے۔ ''پہلی اسلامی تہذیب، دوسری پاکستانیت، تیسری کردار کی بلندی اور چوتھی انسان دوستی۔'' وہ ایک سچے مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسلامی تہذیب سے خوب آشنا ہے۔ ان کا نعتیہ شعری مجموعہ ''نور نہایا رستہ'' اس بات کی دلیل دیتا ہے کہ جلیل عالی، موجودہ عہد کا وہ ولی اللہ ہے جس نے اپنے سینے کو عشقِ محمدؐ سے منور کر رکھا ہے اور یہ شدتِ طلب جب جب بڑھتی ہے تو وہ اپنے خالق کے محبوب کی بارگاہ میں ہدیہ نعت کہنے کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ محبِ وطن ہونا بھی سچے پاکستانیت ہونے کی ضمانت ہے۔ عالی صاحب ایک باوصف آدمی ہے اور ان کے اندر وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ جس کا تذکرہ ان کی نظموں اور اشعار کی صورت میں جابجا پڑھنے کو ملتا ہے۔

''کردار کی بلندی'' یہ وہ خصوصیت ہے جو ہر ایک انسان میں بہت کم کم پائی جاتی ہے۔ کیونکہ اعلیٰ ظرف ہونا ہی کردار کی بلندی اور انسان کی شخصیت کو اعتماد بخشتا ہے۔ عالی صاحب حسنِ کردار کی وہ تصویر ہے جس میں کوئی داغ نہیں۔ اس حوالے سے جان کاشمیری کا ایک شعر ہی کافی ہوگا۔

پسِ پردہ بھی تکلم سے گریزاں رہنا
لوگ آواز سے تصویر بنا لیتے ہیں

.....

عالی صاحب کی شخصیت میں ''انسان دوستی'' کا امتزاج گلاب کی تازہ مہک کی طرح ہے۔ جس کی شاخ سے الگ ہو جانے پر بھی خوشبو کم نہیں ہوتی۔ اُن کے برتاؤ میں تصنع یا بناوٹ نہیں۔ وہ خود ستائی سے بھی پرہیز کرتے ہیں، دوسروں کی تعریف و توصیف میں تنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ وہ ایک سچے فنکار ہیں جو صرف سچائی پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں منشاء یاد کا کہنا ہے کہ ''شاعر کی حیثیت کے علاوہ جلیل عالی ایک متوازن تنقیدی شعور رکھنے والا دانشور بھی ہے۔ معاشرتی رویوں، تہذیبی کروٹوں اور زندگی کی حقیقتوں کے بارے میں ہمہ وقت غور و فکر کرتے رہنا، معاصرین سے مکالمہ و مباحثہ جاری رکھنا اور چیزوں کی اصلیت کا کھوج لگاتے رہنا اُس کے علمی اور ذہنی مشاغل ہیں۔''

عالی صاحب ذاتی طور پر خوش اطوار اور قابلِ بھروسہ شخص ہیں جن پر دونوں آنکھیں بند کر کے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ فلسفہ اور منطق کے طالب علم ہونے کے باوجود خشک طبیعت نہیں بلکہ عمدہ حسِ مزاح رکھتے ہیں اور فقرہ کسنے میں بھی ماہر ہیں۔ وہ جیسے باہر سے دکھائی دیتے ہیں ویسے ہی اندر سے سادہ اور معصوم اور تھوڑے سے شرارتی معلوم ہوتے ہیں۔ بقول خاور اعجاز ''اختلاف رکھنے والوں پر بھی محبت کی نظر ڈالنے کو گناہ نہیں سمجھتے۔ مروت اور وضعداری اُن میں کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی ہے۔ کبھی کبھی آج اور کبھی کبھی کل کے اندیشے میں غلطاں ہو جاتے ہیں۔ خلوت کا حال تو آج تک کسی پر نہیں کھلا البتہ جلوت میں بعض اوقات ایسے کھل جاتے ہیں کہ خود پر قابو نہیں رکھ پاتے۔'' عالی صاحب کی متحرک زندگی ہی اُن کی چاق و چوبندی کا راز ہے۔ اُن کی گفتگو منطقی اور عقلی دلیلوں پر مبنی ہوتی ہے بقول شاعر:

حقیقت پہ مبنی ہیں کردار سارے
مرے پاس جھوٹی کہانی نہیں ہے

.....

جلیل عالی تہذیب کا شاعر ہے۔ میری نظر میں تہذیب کا شاعر اس کو کہا جاتا ہے جس میں لفظوں کا چناؤ کا سلیقہ ہو، احترام آدمیت اس کا خاصہ ہو، معاشرتی اقدار کی پاسداری کا ضامن ہو، تہذیب و تمدن کے آداب سے واقفیت خاص ہو اور یہ تمام خوبیاں جلیل عالی کی ذات اور شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ڈاکٹر اجمل نیازی انہیں ''جلیل القدر

انسان'' کا لقب دیتے ہوئے رقم طراز ہے کہ ''جلیل عالی ایک جلیل القدر انسان، شاعر اور دانشور ہے۔ تخلیقی دیانت اور استقامت جس کا شعار ہے۔ درویشی اور دلیری اُس کے وجود میں وجد کرتی ہے۔ دلیری اور دلبری میں صرف ایک نقطے کا فرق ہے، اُس نے یہ فرق بھی مٹا دیا ہے وہ پاکستان کے اُن چند لوگوں میں سے ایک ہے جو سرمایہ افتخار ہوتے ہیں، جن کے نزدیک ساز و سامان سے بڑھ کر انسان کی قدر و منزلت ہوتی ہے۔''

عالی صاحب موسیقی سے بھی گہرا شغف رکھتے ہیں۔ انہیں کلاسیکی اور نیم کلاسیکی راگ اور گیت بڑے شوق سے سننا پسند ہے۔ ایک تقریب میں جب عالی صاحب سے موسیقی کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا ''موسیقی تو آفاقی زبان ہے اور اعلیٰ تر معیار کلاسیکی کا ہی ہے۔ گاتے تو سبھی ہیں مگر شعر کی روح، لفظوں کے مفہوم اور اُن کی جگہوں کا خیال رکھ کر گانا کوئی کوئی جانتا ہے اور خاں صاحب (حامد علی خاں) کلاسیکی موسیقی میں ایک بڑا نام تو ہیں ہی، غزل کی گائیکی میں بھی ایک منفرد اور معتبر مقام رکھتے ہیں''۔ یاد رہے کہ اس موسیقی کی محفل میں اُستاد حامد علی خاں نے جلیل عالی کی ایک غزل رچاؤ سے گائی تھی جس کا مطلع کچھ یوں تھا کہ:

منزل منزل ساتھ صدا کا تیرا میرا
جھلمل جھلمل شوق ستارا تیرا میرا

.....

ان کی ادبی زندگی کا آغاز تو دسویں جماعت کی الوداعی تقریب کے لیے ایک نظم لکھنے سے ہُوا۔ جس کا مصرع کچھ یوں تھا کہ ''الوداع اے دوستو، یاروں کے یارو الوداع''۔ مگر جلد ہی ان کا شوق افسانہ نویسی کی جانب مڑ گیا لیکن جلد ہی وہ شاعری کی طرف پلٹ آئے۔ آزاد، پابند اور معریٰ نظمیں بھی لکھیں۔ قطعات بھی لکھے، ماہیے بھی کہے، حمد و نعت اور سلام میں بھی پیچھے نہیں رہے۔ مختلف موضوعات پر مضامین اور تنقید بھی لکھی لیکن ان سب جہتوں کے باوجود غزل ہی اُن کا من پسند صنفِ ادب اور اولین ترجیح رہی۔ اس مضمون کے دوران میں نے چند سوالات پوچھے جن کے جوابات دیتے ہوئے انہوں نے کہا ''انٹرمیڈیٹ میں عاصی سے عالی کیا۔ میں اُس وقت جمیل الدین عالی کے نام سے واقف نہیں تھا۔ زندگی جیت نہیں ہار سہی پھر کیا ہے، چار دن کچھ تو کشاکش میں مزہ آئے گا، انٹر کے زمانے میں کسی سے نہیں اصلاح لی بلکہ شاعر دوستوں کی صحبت

اور مطالعے سے سیکھا"۔ ان کی تصانیف میں "خواب دریچہ" (غزلیات)، "شوق ستارہ" (نظم وغزل)، "عرضِ ہنر سے آگے" (نظم وغزل) ان کتب کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اسے 2005 اور 2007ء میں رائٹرز گلڈ ایوارڈ اور احمد ندیم قاسمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ ان کے کلام پر مبنی انتخاب خاور اعجاز کا "لفظ مختصر سے مرے" اور "ایک لہر سی بھی" (غزلیات)، "دن بدلتے نہیں" (نظمیں)، "عشق دے ہور حساب" (پنجابی کلام)، "شعری دانش کی دُھن میں" (تنقیدی مضامین)، "نور نہایا رستہ" اور "قلبیہ" جیسی شعری تصانیف اشاعت پذیر ہو کر کائناتِ ادب پر اپنی کرنیں بکھیر رہی ہیں۔ انہیں ادبی خدمات کے اعتراف میں بہت سے ادبی ایوارڈز بھی مل چکے ہیں جن میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے "تمغۂ امتیاز" برائے ادب ۲۰۱۶ء شامل ہیں۔ ان کی شخصیت وفن پر بہت سے ایم فل کے مقالہ جات اور ادبی جرائد کے خصوصی نمبر شامل ہیں۔

جلیل عالی کی شاعری، فن وشخصیت اور موضوعات کو ایک مضمون میں قلمبند کرنا یقیناً ناممکن ہے اس لیے آخر میں "پاکستانی ادب کے معمار" سیریز میں "پروفیسر جلیل عالی شخصیت اور فن" جس کے ابتدائیہ میں خاور اعجاز "میری خوش قسمتی ہے کہ اکادمی ادبیات نے جلیل عالی پر کتاب مرتب کرنے کے لیے میرا انتخاب کیا۔ میں نے اپنی سی کوشش کی ہے کہ عالی کی نمایاں ادبی جہات پر اپنی بھرپور صلاحیتوں کیساتھ سیر حاصل تبصرہ کر سکوں۔ مجھے اندازہ ہے کہ ڈھائی سو سے کچھ اوپر صفحات تحریر کر لینے کے بعد بھی عالی کی شخصیت کے بعض گوشوں کا احاطہ نہیں ہو پایا۔ میرے خیال میں اُن کی مکمل ادبی سرگرمیوں کو سمیٹنے کے لیے لگ بھگ اتنے ہی صفحات مزید درکار ہوں گے جو ممکن ہے اس کام کی اشاعت کے مرحلے میں حائل ہو جائیں، سو عالی کی تخلیقی ذات کے باقی ماندہ اجزا پر روشنی ڈالنے کے مرحلے کو آئندہ کسی مناسب موقع کے لیے محفوظ خیال کیجیے۔" جبکہ اس کتاب کا پیش نامہ پروفیسر ڈاکٹر یوسف خشک نے لکھا جو اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین کے منصف پر فائز ہے۔ اس خوبصورت کتاب پر میں خاور اعجاز اور اس کتاب کی تدوین، تزئین و آرائش اور طباعت پر اکادمی ادبیات پاکستان کی کاوشوں کو ڈھیروں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

ابوالطاہر فدا حسین فدا کا ''خمستانِ سرمدی''

دنیا کے شہروں میں ''لاہور'' کی جو نمایاں اہمیت ہے وہ زیادہ تر لاہور کے ''فصیلی شہر'' (Walled City) کے حوالے سے ہے جو کہ لاہور کے بارہ تاریخی دروازوں اور فصیلِ شہر کے اندرون کا لاہور تھا اور اس کا بھی وہ دور جو قیامِ پاکستان (14 اگست 1947) سے قبل کا تھا۔ اُس دور کے لاہور کی ایک نمایاں بات یہ بھی ہے کہ اس لاہور میں زیادہ تعداد اردو نثر نگاروں اور پنجابی زبان کے شعرا کی ملتی ہے بلکہ اردو شعرا نسبتاً کم ہیں۔ بیسویں صدی کے اردو شعرا میں علامہ اقبال ہی کا نام نمایاں ہے۔ اس صدی کے نصف آخر میں اندرون لاہور کے شعرا میں تنویر نقوی اور ابوالطاہر فدا حسین فدا کافی نمایاں ہیں۔ فدا حسین فدا کا تعلق اندرون موچی دروازہ لاہور سے تھا۔ وہ متعدد کتب کے خالق تھے اور نصف صدی تک تخلیق ادب میں سرگرم رہے۔ ان کے شعری استاد علامہ تاج عرفانی تھے۔ ابوالطاہر فدا حسین فدا نے غزلوں، نظموں، نعتوں اور قطعاتِ تاریخ میں نام کمایا۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ ''خمستانِ سرمدی'' 2002 میں راہی پبلشرز، 30۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور نے شائع کیا۔ 224 صفحات کے اس مجموعہ میں ان کی اَسّی سے زائد نعتیں تھیں۔ اس کتاب کے دیباچہ نگاروں میں نامور اہل قلم شامل تھے۔ ان میں ڈاکٹر وحید قریشی، خواجہ عابد نظامی، ڈاکٹر پروفیسر آغا سہیل، سید وحید الحسن ہاشمی، سردار علی احمد خاں، علامہ عرشی امرتسری اور پروفیسر پیرزادہ محمد اسرار حسین بخاری (صدر شعبۂ عربی، گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور) کے نام ملتے ہیں۔ ان سب نے فدا حسین فدا کی شعری صلاحیتوں کی خوب تحسین کی ہے۔ پیش لفظ میں فدا حسین فدا اپنے بارے میں لکھتے ہیں: حضورؐ پُرنور سے عقیدت و محبت کا شرف مجھے وراثتاً ملا ہے۔ ''میرے والدین کی کریمین اور اجداد مسلکاً اور مشرباً حنفی المذہب تھے۔ سلسلۂ عالیہ قادریہ سے وابستہ ہونے کے باوصف دیگر جملہ سلاسلِ اولیاء اللہ سے عقیدت رکھتے

ممتاز راشد لاہوری

تھے، عید میلادالنبیؐ مناتے تھے۔ ان کی تربیت کی وجہ سے میں عرصہ سے ہمہ تن مصروف حمد و ثنا ہوں۔"

"خمستانِ سرمدی" میں نامور محقق ڈاکٹر وحید قریشی کے دیباچے میں درج ہے کہ "فدا حسین فدا شعرا کے اُس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جسے پنجاب میں علامہ تاجور نجیب آبادی یا اُن کے حلقۂ اربابِ علم کی روایت کہتے ہیں، اس کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ علامہ تاجور اور ان کے ساتھیوں نے صحتِ زبان پر زور دیا اور پنجاب میں شاعری کے فنی پہلوؤں میں احتیاط کی روش اختیار کی، انھوں نے زبان و بیان کے تجربے بھی کیے لیکن زیادہ کام روایت کو مستحکم رکھنے میں کیا، ان کے ہاں کا آہنگ سادہ اور اکہرا ہے، غالب کی طرح مختلف تہوں والا نہیں....."

فدا حسین فدا نے اپنے پیش لفظ میں اپنی یہ نعتیہ رباعی لکھی ہے:

میرا سینہ آئینہ وحق آگہی ہے
میرا دل مہبطِ عشقِ نبیؐ ہے
دل قدسیاں بھی ہیں فدا مخمور
نشہ "خمستانِ سرمدی" ہے

"خمستانِ سرمدی" میں سے ان کی نعتوں کے چند منتخب اشعار نذرِ قارئین ہیں:

نہ ہوں میں ہمسرِ حسانؓ نہ کوئی صاحبِ دیواں
سگِ درہوں فدا میں تو گدایانِ شہِ دیںؐ کا

.....

انوارِ اسمِ ذات کا بے شک ہے تو امیں
اور ہر مہرِ نبوت میں نگینہ تیرا

.....

جگمگاتے لفظ آ جاتے ہیں میرے سامنے
میری پروازِ تخیل کو ضیا دیتا ہے کوئی

.....

عرشِ اعلیٰ سے شہیدانِ وفا کو اب بھی
نطقِ محبوبِ مشیت کی ندا آتی ہے

.....

جنت کی جیتے جی ہمیں مل جائے گی نوید
ہو جائے خواب ہی میں جو زیارت حضورؐ کی

.....

رواں ہر نبی ہے اُسی سمت دیکھو
ہیں استادہ جس جا خیامِ محمدؐ

.....

آپ کا درد ہی ہر درد کا درماں نکلا
نکلا آنسو بھی تو غارت گرِ عصیاں نکلا

.....

یہ میری خوش نصیبی ہے، یہ فیاضی ہے قدرت کی
فدا اُس جانِ رحمت پہ دل و جاں سے فدا ہوں میں

.....

فدا حسین فدا نے 2004 میں لاہور، وفات پائی۔ ان کی نماز جنازہ داتا گنج بخشؒ کے مزار سے ملحقہ مسجد میں ادا ہوئی اور انھیں لاہور کے قدیمی اور سب سے بڑے قبرستان "میانی صاحب" میں دفن کیا گیا، اللہ انھیں روح کی آسودگی عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆☆☆

افتخار شفیع کی دو کتابیں: مختصر جائزہ

(۱۔ شواہد الالہام از مولانا حالی مرتبہ افتخار شفیع)

ڈاکٹر محمد افتخار شفیع وہ نونہال ہیں جنھوں نے اس عاجز کی آنکھوں کے سامنے نشوونما پائی ہے۔ علم و ادب کے ساتھ ایسی وابستگی کی نظیریں نایاب تو نہیں کم یاب ضرور ہیں۔ مستقل لگن نے انھیں ملکی سطح پر پہچان عطا کی ہے۔ متعدد معتبر کتب کے مصنف اور مولف ہیں۔ کم عمری میں ہی گورنمنٹ کالج ساہیوال میں صدر شعبہ اردو کے منصب پر فائز ہونے کا اعزاز پالیا ہے۔ حال ہی میں ان کی تالیف بہ عنوان: ''شواہد الالہام''، منظر عام پر آئی ہے۔ فی الاصل یہ مولانا الطاف حسین حالی کا تحریر کردہ ایک اہم رسالہ ہے جو مدت مدید تلک ناپید رہا؛ یوں ان کی دیگر علمی کاوشوں کی طرح موضوع گفتگو نہ بن سکا۔ اس کا ایک جزو: 'نبی کی ضرورت پر ایک وجدانی شہادت' تو: 'مقالات حالی: جلد اول/ مولوی عبدالحق میں شامل ہونے کی وجہ سے ایک حد تک قاری کی رسائی میں تھا جبکہ مقالے کا دوسرا حصہ: 'وحی اور الہام کی ضرورت پر عقلی دلائل' بہت محدود اشاعت کے حامل ایک جریدے: ''فردا'' میں طبع ہوا تھا۔ بہر قصہ افتخار شفیع صاحب نے مولانا حالی کی یہ وقیع نگارش محفوظ کرنے کا فریضہ احسن انداز میں انجام دے دیا ہے۔ مرتب نے چوبیس صفحات پر مشتمل مقدمہ تحریر کر کے متعلقہ موضوع کے مالہ و ماعلیہ کو عمدگی سے بیان کیا ہے۔ ایک ایسا موضوع جو مابعد الطبیعات سے تعلق رکھتا ہو اس کی فکری و عقلی جہتوں پر بات کرنا سہل نہیں ہوتا۔ خود حالی بھی اس مشکل سے دوچار ہوئے لیکن ان کے عہد کا تقاضا تھا کہ یہ صداقت اسی رنگ میں اصحاب علم کے روبرو رکھی جاتی کہ ریشنلزم ہی میٹا ریشنل ڈیٹا کے لیے کسوٹی بن چکا تھا۔ اس لیے مولانا کی نیت پر شک کی کوئی گنجائش پیدا نہیں ہونی چاہیے۔ ویسے بھی اپنی نجابت اور شرافت کے مطابق وہ اولیا اصفیا کی صف کے آدمی تھے۔ افقی پھیلاؤ کے دور میں عمودی طرف کا اثبات ایک دشوار گزار راستا ہے؛ باقی رہا وحی اور الہام کے مابین تفاوت تو جوہری فرق کا تعین شاید مشکل ہو۔ اس طرح یہ سوال

جمیل احمد عدیل

اہمیت اختیار کر جاتا ہے کیا الہام ملہم اور ملہم کے بیچ ہی کوئی معنویت رکھتا ہے یا باقیوں کے لیے بھی حجت ہوتا ہے۔؟ مع الحدیث! یہ تصنیف نہایت غیر معمولی ہے۔

(۲۔ مجید امجد: نئے تعینات)

ڈاکٹر محمد افتخار شفیع ایک جوہر قابل ہیں! اس باب میں دوسری رائے نے اپنے اثبات کے لیے ایک قدم کی پیش رفت بھی ظاہر نہیں کی۔ تخلیقی ساعتوں میں وہب کے مصادر سے ان کا انسلاک داخلی وارد سے موسوم ہوگا، یوں اس مناسبت سے شہادت خود کو باور نہیں کرا پائے گی کہ یہ ایسا سر ہے جس کی بابت خود تخلیق کار بھی بجز تحیر کے کوئی ثروت نہیں رکھتا لیکن تحقیق و تنقید کے منطقے اپنے معروضی پیمانوں کے ساتھ موثر ہو کر عام قاری کو پارکھ اور ان لہروں کے باقاعدہ شناور کو سخت گیر داور بنا ڈالتے ہیں۔ افتخار شفیع نے اگر بطور نقاد اور محقق خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا ہے تو یہ ان کی 'ذاتی صفت' نہیں بلکہ ان کی برسوں کو محیط ریاضت متکلم ہوئی ہے۔ اس سارے عرصے میں انھوں نے علمی جستجو کو مشعل بنائے رکھا، اسی لیے وہ سدا تحقیق کے جزیروں سے نوادر لائے اور جہان نقد سے وابستگی کو حوالہ بنایا تو اپنے سنجیدہ قلم کو رائے کے انفراد پر پابند کیا۔ افتخار کے مستقل قاری کی حیثیت سے عرض کرنا ہے کہ ان کی تنقید نے کبھی جملے کی آرائش سے کمک طلب نہیں کی وگرنہ نثر نگاری پر قدرت میسر آتے ہی نقاد کے اندر چھپا ہوا 'طاؤس طناز' شوخ فقروں کی بازیگری سے قاری کی توجہ معاً گرو کی رکھ لیتا ہے۔ انڈو پاک کے بعض جگادری نقادوں نے اپنے تیکھے فقرات سے خوب شہرت کمائی ہے۔ کمال انھیں یہ حاصل ہوا کہ ایک بار تو وہ قاری کو لبھا کر بھلا دیتے ہیں کہ 'نفس مضمون' کیا تھا! افتخار شفیع نے شعاعوں کے رقص سے چکا چوندھ کا اہتمام اس لیے ضروری نہیں سمجھا کہ ان کا ارتکاز حقائق کے پیش کار کونٹینٹ پر رہتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو وہ لفظ سے لفظ جوڑ کر جملہ تشکیل دینے کی بجائے مواد کو متن میں منقلب کرنے کا اعجاز دکھاتے ہیں۔ واضح رہے یہ سارا اثاثہ 'درمکنون' کی شکل میں ہوتا ہے۔ ترتیب نو میں حیات کا مضمر ہونا چونکہ ان پہ کھل چکا ہے اس لیے ان کی نگارش تازگی کا ارمغان اپنے ساتھ لاتی ہے۔

''مجید امجد: نئے تعینات'' سے معنون ان کی نسبتاً مختصر کتاب میں عہد رواں کے نابغہ مجید امجد موضوع بنے ہیں۔ اب مجید امجد مرحوم کا معاملہ یہ ہے کہ اس تہنیس نے 'عام قبولیت' کا مرتبہ حاصل کر لیا ہے۔ اس کے باوجود کہ ان کی تخلیقات آج بھی 'خواص' سے علاقہ رکھتی ہیں کہ ان کا اختصاص ہی یہ ہے کہ وہ فرد پر رکیں یا کسی کائناتی زاویے کو نظم کریں 'تعیم' سے وہ خود کو کوسوں دور رکھتے ہیں۔ عمق ان کی شناخت ہے۔ سکہ رائج الوقت' ان کی نگاہ میں متروک شے ہے۔ اسی لیے انھیں پڑھتے ہوئے تفہیم کا عمل فعال ہونے کا مطالبہ سامنے

لے آتا ہے۔

افتخار شفیع کے ان مقالات کی خواندگی سے یہ تو بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ وہ پہلے کی طرح اب بھی مجید امجد سے جڑ کر مقناطیسی لہروں کے ذریعے خود 'سنگ آہن ربا' میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس تناظر میں مجید امجد کی نایاب نعت کا موضوع ہو یا ان کی فلکیات کے غوامض میں غواصی ہو۔ تقسیم ہند کے تعلق میں مناقشت کا ابھرنا ہو۔ تہنیتی پس منظر میں احباب کے لیے ان کے شعری اظہارات ہوں۔ شاعر کی سرمدی پہچان کے جادے پہ گام زن شخصیت کی نثری استعدادوں کا تعین ہو۔ 'متھ' بن جانے والے اس شاعر کی نجی زندگی میں تنہائی کے عنصر کی حشر سامانی ہو------- ہاں! یہ سب ان صفحات میں سمٹ کر ادب کا صحیفہ ہو گیا ہے۔ درحقیقت اس کتاب نے چنیدہ موضوعات پر گفتگو کو بند نہیں کیا بلکہ تکلم کے در وا کیے ہیں۔ تعینات تو کا مفہوم ہی یہ ہے جو پیش کیا گیا ہے وہ حتمی/قطعی نہیں۔ ایک تعین دوسرے تعین کے امکان کو ظاہر کرتا ہے۔ افتخار شفیع کی رسائی جن مناہج تک ہوئی ان کی روشنی میں وہ مجید امجد کی ان اکناف کو سامنے لائے ہیں جو سربستہ تھیں یا ان میں سے کئی قدرے اوجھل تھیں۔ اگر نیا محقق کچھ اور ڈھونڈ لائے گا تو ان سے ہٹ کر بھی استخراج اپنی حیثیت کو منوانے کی صورت بنا سکے گا۔ ان مقالات کو پڑھتے ہوئے مقالہ نگار نے قاری کو شخصی سطح پر اعتماد کے کلاوے میں نہیں لیا بلکہ اپنے موقف کو پایہ ثبوت تک پہنچاتے ہوئے اس سلک در کو حوالہ بنایا ہے جس نے گزران میں اپنے حصے کی شمولیت کو برہان بنایا ہے مگر اس تصنیف میں رٹی /تدریسی انتقاد کی مثال کہیں 'حوالہ برائے حوالہ' کی باربرداری دکھائی نہیں دے گی۔ یوں یہ اجمال اختصار کا ترجمان نہیں بلکہ جامعیت اور ایجاز کی دلیل ہے۔ اس کتاب کے مندرجات اس لیے بھی اپیل رکھتے ہیں کہ مجید امجد نے اخذ و استفادے کے لیے جن سروکار پر انحصار کیا، محقق نے ان مآخذ کی تصریح کے ساتھ نشان دہی کی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجید امجد محض 'الہام کے بھروسے' پر قانع نہیں تھے، وہ فکری تجسس رکھنے والے قاری بھی تھے یوں معاصر سائنسی /معروضی/علمی/کائناتی حقیقتوں پر لکھی گئی کتب و رسائل سے وہ گہرا ارتباط رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں یہ کریڈٹ بھی افتخار کے نام درج ہوگا کہ وہ آگہی رکھتے ہیں مجید امجد کے ہاں جاننے کا تجسس ایک اکل کھرے سائنٹسٹ ایسا نہیں تھا۔ وہ دنیاتی صداقتوں اور سماجی مالہ وما علیہ کی کاریزوں کو تخلیق کے سرچشمے سے منسلک دیکھنے کی چاہت رکھتے تھے۔

جیتے رہیے افتخار! آپ کے 'نئے تعینات' نے 'نئے مجید امجد' سے ملاقات کرائی ہے۔ اس عالم نو میں شناسائی کے مرحلے جگ مگ جگ مگ کر رہے ہیں!!

☆☆☆☆☆

ہُوک

جب کتابوں کے نوشتوں سے پھسل کر
مری درماندہ نگاہ
چار سُو پھیلے ہوئے صفحۂ ایام پہ جا پڑتی ہے
دل میں اک ہوک سی اُٹھتی ہے
ابھر آتے ہیں دکھتے ہوئے جانکاہ سوال
پھر اسی ہوک کے لہجے میں خدا بولتا ہے

''زندگانی کی کڑی شرطیں ہیں
یہ عبادت ہے تمھاری کہ مرے بخشے ہوئے دکھ جھیلو
ان پرندوں کا، بہائم کا تصوّف دیکھو

کیسے منقار شکستہ طائر
دانے دانے کو ترس جاتا ہے دانوں میں گھرا
مشتِ پر خاک میں ڈھل جاتی ہے رفتہ رفتہ
جان کھو دینے کے بے زار ارادے کے بغیر
کسی شکوے کے بغیر''

اور یہ مجھ سے بڑا درس سمجھ میں نہیں آتا میری
کِس لیے اس کی مشیت نے کیا دکھ پیدا
سوچتا ہوں تو ڈھلک آتے ہیں اشکوں میں سوال
ہے مری سوچ مرے اپنے لیے ایک عذاب
اُس پہ عائد ہی نہیں میرے سوالوں کا جواب

خورشید رضوی

محمد علی سدپارا کے لیے ایک نظم

اک برف کے پھولوں کی چادر کے تلے لیٹا
وہ مردِ جفا پیکر
وہ خوف سے بیگانہ اور عزم کی مشعل کے
ہر رُوپ کا پروانہ
جو موت کی آنکھوں سے آنکھوں کو ملانے کی
ایک موج میں رہتا تھا
اور جُھوم کے کہتا تھا
''اس برف کے دریا کے اس پار میں جاؤں گا
جو کوئی نہیں کرتا وہ کر کے دکھاؤں گا''

وہ برف فضا جس کی منہ زور بلندی پر
وہ چپ تھی رواں، جس میں
خود اپنے تنفس کی، آواز سوا کوئی
آواز نہ آتی ہو
اور سانس کے رکنے کا اندیشہ فضاؤں میں
ہر گام پہ پھیلا ہو
اور ایک نیا طوفان ہر موڑ پہ ملتا ہو
اور موت کی آہٹ جب ہر سمت سے آتی ہو
نخوت سے بھری چوٹی، خدشوں کے سوا جس پر
آباد نہ ہو کوئی

وہ اُس کی فضاؤں میں
لہراتا ہوا پرچم، اس شان سے پہنچا تھا
ماتھے پہ رقم اُس کے
انسان کی عظمت کا پُر نور حوالہ تھا
ہر سمت اُجالا تھا

ممکن ہے کہ کچھ بزدل، دیوانہ کہیں اُس کو
عقل اور تدبر سے، بیگانہ کہیں اُس کو
وہ لوگ مگر اس سے آگاہ نہیں شاید
سو آج ہمیں پھر سے یہ شعر سنانا ہے
''یہ عشق نہیں آساں، بس اتنا سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے''
تاریخ کے صفحوں پر
ایسے ہی دوانوں کے
ہیں نام سدا روشن
اور اُن کی ضیا سے ہی یہ بزم منور ہے
اور اُن کی بدولت ہی آباد یہ منظر ہے

امجد اسلام امجد

سہ سطریاں

نسیمِ سحر

پاکستان، جو ہم سب کی اُمیدوں کا سرمایا ہے
پاکستان، کہ جس سے ہم نے جو کچھ چاہا، پایا ہے
ہم سے پوچھ رہا ہے، ہم نے اس کو کیا لوٹایا ہے؟

☆

کبھی یہ غور تو کرنا سبب ہے کیا اس کا؟
وفا کے ذکر پہ سب میری بات کرتے ہیں
جفا کے ذکر پہ سب تیری بات کرتے ہیں!

☆

شہر کے مرکزی چوراہے پر
چاروں سگنل ہی سُرخ رہتے ہیں
اور ٹریفک بلاک رہتی ہے!

☆

اب تو ایسا لگتا ہے
جتنی سانسیں باقی ہیں
اتنی پھانسیں باقی ہیں

☆

صاف گو اور کھرا آدمی ہوں
منہ نہ کھلوایئے میرا ہرگز
مَیں تو بارُود بھرا آدمی ہوں!

بیٹی

مری ننھی کلی
تیرے شگفتہ پھول بننے تک
تری ہر جنبشِ لب پر
میں اپنا سب نچھاور کرتا آیا ہوں
ترے پہلے اشارے پر
میں اپنی آخری سانسیں بھی تجھکو سونپ سکتا ہوں
میں تیری جنبشِ ابرو کا نوکر ہوں
ترا بابا ہوں لیکن پھر بھی
تیرے پھول سے پیروں کی ٹھوکر ہوں
وہ جسکو تو نے اپنے غنچۂ دل میں بسایا ہے
قدم جسکی طرف تو نے بڑھایا ہے
مہک جسکی تری سانسوں
چمک جسکی تری آنکھوں میں ہے
میری عزیز از جان بیٹی!
تو نے کیوں سوچا
زمانے کی طرح میں تیرا رستا روک سکتا ہوں

ضرور اس دن دعائے مغفرت کرنا
کہ مجھ چھوٹے سے بندے نے سنا ہے
وہ خدائے لم یزل سب سے بڑا ہے
اور بڑے لوگوں کی سنتا ہے !

صفدر صدیق رضی

بڑا آدمی

پسر زادے
یقیناً ایک دن
جب تم بھی دنیا کے بڑے لوگوں میں ہو گے
میں منوں مٹی تلے،
اتنی بلندی پر
تمہاری عظمت و رفعت کے منظر کو
نہ شاید دیکھ پاؤں
سو تم اپنے پیشرو مرحوم دادا کیلئے جا کر

دیارِ صوت میں سناٹا!

بات کر اے رات
کوئی بات کر
اتنا سناٹا کہاں سے لائی ہے
ڈھیر ساری خامشی
تجھ کو کہاں سے مل گئی
جو دیارِ صوت میں رکھنا تو ممکن ہی نہیں
عالمِ ہُو میں سکوت
پہلے کیا کم تھا کہ اب تو بھی یہاں
بے صدا آہنگ لے کے آ گئی
شام سے در پہ کھڑی ہے
بولتی کچھ بھی نہیں
کیا ہُوا، کچھ تو بتا
کون ہے جو دن نگل کے شب اُگلتا ہے یہاں
اور پھر تاروں سے بُنتا ہے ردائے کہکشاں
چاندنی صہبا طراز
جرعہ جرعہ وہ اُنڈھا کے دے صدا
روک لو
سانس تک بھی روک لو
اک الم انگیز رُت کا سانحہ ہونے کو ہے
موسمِ گُل میں زمستانی شراب
وقت کے مٹکے سے ساری بہہ گئی
اب ہوا نوحہ کناں
شہرِ نابُرساں میں ہے
جس میں کوئی آنکھ نم دیدہ نہیں
ایک گہری خامشی ہے چاروں اور
خواب گاہوں میں ردائے نیند پہ
سسکیاں سلمیٰ ستارہ بن گئیں
کون آنکھوں کی سنہری پُتلیاں
کھینچ کر گرہیں لگائے خواب کی
رات ہے اور رات سناٹا کہیں سے لائی ہے
شہرِ نابُرساں دیارِ صوت میں
خامشی رکھنے کی کوئی جا نہیں
اک دلِ آزردہ کی دھڑکن سوا
کون ہے جو خامشی کو تھام لے؟

علی اصغر عباس

وہ اعلان کرتے ہیں

یہ سخاوت تو بس خیر ہی خیر ہے
وہ کہ اعلان کرتے ہیں
کچھ کھردرے ٹین کے سبز ڈبوں کو
دہکی ہوئی لاکھ سے بند کرتے ہُوئے

گہرے خطِ غربت و یاس
اور ایک جذباتی الحاق کے آس پاس

اے مرے مہرباں صاحبو!
تھوڑی سی روشنی کا عطیہ کرو
میری آنکھوں کے ناخواندہ اشکوں کی
تہذیب کا واسطہ
میری سانسوں کی ناکردگی کو مقدس معانی
کی ڈھارس ملے

لیجے، نایافت الفاظ پھر کھو گئے

خود فراموشی یا خودستائی؟

ترستی، یہ دم توڑتی شہرِ رفتہ کی مانوس یادیں
وہ دن جو جیے بھی نہیں جا سکے
زندہ نوحے کہ حرف فنا ہو چکے

مشرقی سی تھکن، اک شمالی سی تنہائی ہے
ایسی بیگانگی ہے کہ
ہم اپنے ہونے، نہ ہونے
کے اصرار سے دست کش ہو چکے ہیں
وہی بین کرتی صدائیں
وہی سُرخ رُو کچھ عزادار پتے
حراست میں لیتی۔۔۔ ہوائیں
اُجڑتے ہوئے جنوری کی یہ ساکت روانی
ادھر منجمد جھیل پر برف کا ایک صحرا
اچھلتا ہوا
سنگ آثار، بے رحم
اِس شام کی گونج کو بھی سنو
شاخِ سرما سے گرتی ہوئی خامشی شور ہے

حامد یزدانی

اس سے پہلے کہ یہ دھند چھٹنے لگے
تہہ لگا کر، سِرے سے سِرے تک
سبھی خواب، سب خواہشیں
نچلی منزل میں رکھ دو
ادھر مصحفِ پارسائی کے نیچے
غمِ نارسائی کے پہلو میں
سوچتا ہوں کہ اب کیا کروں؟
یہ عجب طنز کا ایک سایہ کہ رختِ عمل میں رہا ہے
رہے گا

مِرے صاحبو!
تم فقط ایسے مرغوب فردا کے
بے داغ وعدوں پہ اپنی گزر کرنا سیکھو،
وہ اعلان کرتے ہیں،
جن پر ذہیجہ کی پاکیزہ سرکاری مہریں لگی ہوں
(مِری عقل ہی کو مِرے دل سے کچھ بَیر ہے!)
یاد رکھو!
سخاوت تو بس خیر ہی خیر ہے۔

پروین شاکر

احمد جلیل

وہ جس کے نام کی بکھری نگر نگر خوشبو
ادب سے روٹھ گئی آج وہ مگر خوشبو
ہر ایک رنگ تھا اس کے سخن اجالے میں
دھنک گلاب شفق تتلیوں کے پر خوشبو
اسے قرینہ تھا ہر ایک بات کہنے کا
سماعتوں کے وہ سب کھولتی تھی در خوشبو
وہ خود کلامی تری تیرا جبر سے انکار
ہیں تیری سوچ کے صد برگ نامہ بر خوشبو
جو تیرے پھول سے بکھری ہے ان ہواؤں میں
ہمیشہ کرتی رہے گی وہ اب سفر خوشبو
نہ جانے اتریں کہاں سے وہ ساعتیں سفاک
نہ جانے کس کی تجھے لگ گئی نظر خوشبو
ادب میں اس کا بدل کوئی بھی نہیں ہے جلیل
سخن میں اس نے بکھیری جو معتبر خوشبو

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

الزام لگائیں گے ، یاروں پہ وہ کیا خالد
یاروں کے سوا خالد، دشمن ہمیں کیا دیں گے

سفر کی راکھ

[نثری نظم]

چلو چھوڑو
نظر انداز کرو
سبھی کو
درد دینے والے ہاتھ
اچھائی اور سخاوت کی ضیافت سے
خالی ہیں
یہ دنیا ہے
ہمیشہ سے
یہی ہوتا رہا ہے
ذرا سوچو
کچھ اپنے بارے میں
تدبر اور تفکر سے

ابھی تم نے
سمندر پار کرنا ہے
محبت کے دنوں پر تازہ نظم لکھنی ہے
ابھی تم نے
وقت اور کام کے توازن کی آرائش کا
بندوبست کرنا ہے
اک خدا کے نام
ای میل میں زندگی لکھنی ہے
مٹی کے اندھیرے میں
خوب صورت باغ کے اندر ٹہلنا ہے
خواب سے جاگنے کی اذیت کا
لطف لینا ہے

امجد بابر

22ویں صدی کے آدم زادو

22ویں صدی کے آدم زادو!
تم کیسے ہو گے؟؟ ہم جیسے ہو گے؟؟
کیسے اُڑتے، اُترتے، زمین پہ چلتے ہو گے
کیا پہنتے، کیا بولتے کیا خواب رکھتے ہو گے
تمھاری محفلیں بھی تو ہوں گی
وہ کیسی ہوں گی؟؟
لمبی مسافتوں کی کہانیاں تو مر چکیں
نئی ایجادوں پہ اُنگلیوں کا
یا انگلیوں کا بھی نہیں.....
رگوں میں مدخول نظریوں کا
عجب کوئی اسرار ہو گا
متروک جذبوں کی مسند پہ
حکم کوئی سردار ہو گا
22ویں صدی کے آدم زادو!
لحاظ، مروّت، دوستی، محبت
یہ چار قبریں کہاں ملیں گی؟؟
غزل، ناول، نظم فسانہ
کدھر ان کا عجائب خانہ؟؟
قلم، قرطاس، رنگ و ساز
کس تابوت میں بند ہوں گے؟؟
کہ جن کی زیارت گر آنکھیں بھی مرحوم و معدوم ہو چکی ہوں
نئی کرسی، نئے معاہدے
نئے دشمن، نئی جنگیں
انجان پُرزوں کی دسترس میں
نئی تکنیک کے بس میں، تگنی کا ناچ نا چنے والو!
22ویں صدی کے آدم زادو!
مانا بہت ترقی یافتہ تم ہو،
فنا کیسے نابود ہو گا؟؟
فنا تو ہر دم موجود ہو گا

دردانہ نوشین خان

نثری نظم

تنہائی نے اس کے اندر نجانے کیسا زہر بھر دیا ہے کہ
اسکے لہجے کی کڑواہٹ
پلکیں نم کر دیتی ہے
لیکن اشک نوکِ مژگاں پر دھرے رہتے ہیں
کیونکہ اسے بین کرتی عورتیں بھاتی نہیں
خاموشی سے تکلم کرتی
دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے یوٹوپیا میں مقید
منھی پری
مجھے انجانے میں تنہائی کے اندھے
غار میں دھکیل رہی ہے
محبت آسمانوں پر نوحہ خواں اپنے
ہونے کا پتا پوچھتی ہے
اداسی کی رم جھم سے من بھیگا رہتا ہے
تہہ در تہہ سناٹے روح کو چھیدتے رہتے ہیں
لفظ بین کرتے ہیں
ایک بھی حرف تسلی میسر نہیں جس سے درد
کی تلافی ممکن ہو
تعلق کے بیچ دراڑ اتنی گہری ہے
کہ اسے پاٹنا عمرِ رواں کے بس میں نہیں
دل نے موسمِ ہجر سے سمجھوتہ کر لیا ہے
کچھ رشتوں کو بچانے کے لئے
مرگِ دل ضروری ہے
مردہ محبت کے مرقد پر پچھتاووں کی گھاس
غم کے موسم کو
سر سبز رکھتی ہے

نائیلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کُھلا مجھ پر درِ امکان رکھنا
مرے مولا ، مجھے حیران رکھنا

دعا

فضل کر پروردگار اب کے برس
چہرۂ ہستی نکھار اب کے برس

جان میں تیرے کرم سے آئے جان
دان کر دل کو قرار اب کے برس

واسطہ تجھ کو ترے محبوبؐ کا
ہم کو پستی سے اُبھار اب کے برس

ایک مدت سے ہے ملت پائمال
مرحمت فرما وقار اب کے برس

ہو نگاہِ لطف، پاکستان پر
جگمگا لیل و نہار اب کے برس

بھیک دے شیرازہ بندی کی ہمیں
ختم ہو دورِ فشار اب کے برس

التجا فیضانؔ کی ہو باریاب
بخش دے امن و قرار اب کے برس

فیض رسول فیضان

بولتی تصویریں

جذبہ و احساس سے خالی
اِن میں محبت نام کی کوئی چیز نہیں ہے
چلتی پھرتی، جیتی جاگتی، بولتی ہیں تصویریں
انسانوں کے روپ میں ہیں
اور سینوں میں ہیں پتھر
دل کا کام دھڑکنا جبکہ پتھر ہے اک بوجھ
جسے اُٹھا کر پھرتے رہنا
سر ٹکراتے رہنا

لیکن میرے کمرے میں ہیں کچھ ایسی تصویریں
گھر میں رہنے والے جب سو جاتے ہیں
اُن کے رات کو نقش نمایاں ہو جاتے ہیں
پھر وہ کاغذ کی تصویریں بولنے لگتی ہیں
اور مرے دکھ درد ٹٹولنے لگتی ہیں

انسانوں سے بہتر ہیں وہ تصویریں
تنہائی میں جب گھبرانے لگتا ہوں
اپنے آپ سے مَیں اُکتانے لگتا ہوں
تو ایسے میں باتیں کرنے لگتی ہیں
مرے پُرانے زخم وہ بھرنے لگتی ہیں

ظہور چوہان

گیان

ہم سانجھ سویر کے یہ چھل بل پہچانتے ہیں
ہم جانتے ہیں
یہ موہ مایا، یہ چھب، یہ پھبن
کچھ ایسے گہرے بھید نہیں
کہ روگ بنیں یہ جیون کا
یہ روپ نیارا موسم ہے
بس کچھ پل میں ڈھل جائے گا
یہ برہا، جوگ، وجوگ سبھی
اک یاد بنیں گے آخر میں
یہ دھونی، سادھنا اور پوجا
اک جنگل میں رہ جائیں گے
اور انت سمے یہ سارے یگ
خاموشی سے بھر جائیں گے
ہم جانتے ہیں ہر ایک جنم
یہ لیلا لیکھ میں لکھی ہے
اک کھیل تماشا ہے یہ سب
گو پتلی بن کر ڈوروں کی
ہر اک فرمائش مانتے ہیں
ہم سانجھ سویر کے یہ چھل بل پہچانتے ہیں
ہم جانتے ہیں

از ہر ندیم

نظم

یہ چادر کیوں نہیں ہٹتی
نہ جانے کیوں بڑی ماں کو جنوں تھا حکمرانی کا
مرے گھر کے سبھی کردار کہتے تھے
انھی کی حکمرانی ہے
انھی کی راجدھانی ہے
انھی کا یہ وتیرہ ہے
حویلی بھر کی جتنی چابیاں تھیں
اُن کے پلو سے بندھی رہتی تھیں
اور کس میں یہ جرأت تھی کہ اُن کو چھو بھی سکتا ہو
یہ خوش بختی مقدر تھی تو میرا تھی
کہ وہ صندوق جب کھولیں تو کمرے میں
فقط مجھ کو بلاتی تھیں
تو میں یوں بے نیازی میں کچھ ایسے
چل کے جاتا تھا
کہ جیسے کوئی شہزادہ
یہ سچ تھا۔۔۔سچ
کہ ابا جب کبھی ناراض ہوتے تھے
تو کہتے تھے
کہ "لقماں دیکھ تیرے پیار نے اس کو بگاڑا ہے
یہ نالائق۔۔۔!
جسے کہتی ہو شہزادہ
شرارت کی پٹاری ہے
تو ایسے میں بڑی ماں ہنس کے کہتی تھیں
اَرے جانے دے، بچہ ہے
یہی تو عمر ہوتی ہے شرارت کی
کہ جب بھی پیسے گننے ہوں
تو وہ مجھ کو بلاتی تھیں
تو میں چپکے سے کچھ پیسے اُڑا لیتا
میں جب بھی پکڑا جاتا تھا
تو وہ ناراض ہو کر منہ کو چادر میں چھپا لیتیں
میں جب بھی توبہ کرتا تھا
مرا منہ چوم لیتی تھیں
مگر اب کے
تو کوئی بھی خطا مجھ سے نہیں سرزد ہوئی
پھر بھی
سمجھ میں کچھ نہیں آتا
وہ کیوں ناراض ہیں مجھ سے!
انھوں نے کیوں چھپا رکھا ہے
منہ مٹی کی چادر سے
یہ چادر کیوں نہیں ہٹتی!

زعیم رشید

رات

رات گہری بھی ہے اور خاموش بھی
تھوڑی جاگی ہوئی اور مدہوش بھی
ایسے بے خواب ہے
نیند سے کوئی جیسے تعلق نہ ہو
اور سنسان ایسی کہ میلوں تلک
کوئی جگمگ ستارہ معلق نہ ہو

رات کا ایسے دامن ہے پھیلا ہوا
دور تک چاند کا کوئی سایہ نہیں
یہ ابھاگن ہے وہ جس کی آغوش میں
پھول کھلتا نہیں، کوئی جایا نہیں

رات کے لب پہ ہے چپ کا پہرا کوئی
بھید ہے اس کے سینے میں گہرا کوئی
اور اک چیخ سا اس کا سناٹا ہے
بے پنہ درد کو اس نے بھی کاٹا ہے

رات لمبی بھی ہے اور سیہ رخت بھی
ہائے تنہا بھی ہے اور سیہ بخت بھی

اس کو سب علم ہے
کس کے بستر پہ پڑتی نہیں ہے شکن
کس کی آنکھوں میں ہے رتجگوں کی چبھن
بھید سب جانتی ہے بتاتی نہیں
شب گزیدہ دریچوں پہ رک جائے تو
پھر یہ جاتی نہیں

رات محرم بھی ہے اور انجان بھی
یہ ہے مہمان پرور بھی مہمان بھی

راز سنتی بھی ہے اور کہتی بھی ہے
آنسوؤں کی صداؤں کی سامع ہے یہ
اپنے حسنِ سخن میں بھی جامع ہے یہ
رات بربط بھی ہے رات سہ تار بھی
رات نغمہ بھی ہے اور صدا کار بھی

یہ حواسوں پہ چھاتی ہوئی اپسرا
دھوکا دے کے چلی جائے وہ دلربا
زلف پھیلائے ہے رقص کرتی ہوئی
اپنا جادو چلا جاتی ہے یہ بلا
جس طرح سرسراتا لپٹ جاتا ہے
پورے تن کو نگلتا ہوا اژدھا
رات دلکش بھی ہے اور دہشت زدہ
رات راحت بھی ہے اور وحشت زدہ

رات کٹتی نہیں پھر بھی کٹ جاتی ہے
بھاگتا دوڑتا دن گذر جاتا ہے
اپنے سائے بڑھائے یہ آجاتی ہے
اور ضدی گھنی اس کٹھن رات کو
اک روپہلی کرن آ کے کھا جاتی ہے
رات منہا بھی ہے اور مقسوم بھی
رات پرکار بھی اور معصوم بھی

شاہدہ مجید

ایک اُداسی بھرے دن کے نام

میں ست رنگی پنسلیں لیے

آسمان میں رنگ بھرنے کی کوشش کر رہا ہوں

کبھی ہمالہ کی بلندی مجھے کم پڑتی ہے

کبھی پنجوں کے بل کھڑا ہو کر آسمان رنگ دیتا ہوں

رنگے ہوئے آسمانی ٹکڑے کو اپنے غم سے ملاتا ہوں

مگر ہزار کوشش کے بعد بھی نمایاں فرق

مجھے نڈھال کر دیتا ہے

میں صدیوں سے سات رنگ

اور سات سُروں کو ڈھونڈ رہا ہوں

کبھی لگتا ہے سات رنگ اور سات سُر

مٹی کی ڈھیری میں چھپے ہیں

اور میں خود ڈھیری پر چڑھا آسمان رنگنے کی

کوشش کر رہا ہوں

اور اسی کوشش میں پنسلیں نہیں

اپنی انگلیاں گھڑ رہا ہوں

اعجاز رضوی

خطوط

آصف ثاقب

بیاض اور پیار سے بھرپور عمران منظور صاحب!
السلام علیکم!

جنوری (نیا سال) کیا چڑھا بارش نے دروازہ کھول دیا۔ اس پہاڑی علاقے کی بارش الاامان الحفیظ!! پوسٹ آفس کا دروازہ کھلتا ہی نہیں۔ ڈاک کو لو ہے لگ جاتے ہیں۔ بہرنوع جنوری کا رسالہ رونق افروز ہوا۔ سچ ہے ہنستے گھر بستے ہیں۔ 'بیاض' سے دل شاد ہوا لکھائیاں دل ربا اور لکھنے والے راضی رضامند پھر کیا چاہیے۔

مضامین کا وقار اور معیار اُسی طرح متاثر کرتا ہے جیسے کہ کرنا چاہیے۔ ہر ہر پر رائے کا اظہار کچھ دشوار ہے۔ بلند و بالا کو 'موضعِ نقد' کرنا ایک کم مرتبے کے انسان کے بس کی بات نہیں۔ جلیل عالی صاحب کی کتاب پر ہارون الرشید صاحب کا مضمون محبت سے لکھا گیا ہے۔ ہارون الرشید موضوع کے انتخاب میں اپنی سی کر دیکھتے ہیں۔ ان کی شاعری بھی خوب اور نثر بھی اچھی۔ کتاب شعری دانش کی دھن میں جلیل عالی کی پراثر نثر ہے اور اس پر تبصرہ ہارون الرشید کی ہنر کا حسن خورشید ربانی صاحب نے قضا روحی۔ احوال و آثار سے شعر و ادب کے بہت سے بھولے بسرے گوشے اُجاگر کیے۔ قضا روحی کے ادبی مقام سے اس طرح کی آشنائی پسند کی جائے گی۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں شروع دن سے اعلیٰ معیار کے ادب نے جنم لیا ہے۔ پرانوں کی تو خیر بات ہی کیا ہے۔ نئے لکھنے والے بھی تحریر کے باب میں چشم نم کے خریدار ہیں۔ بڑے بڑے (قاصر وہاں) ممتاز ہوئے۔ ملاحظہ ہو:

کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا

یہاں کوئی بھی محبت میں ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا چاہتا کہ ان کو اور کام بھی نہیں آتا۔ ڈیرے کی مستحسن ادبی روایات فراواں ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے ہمارے صوبے خیبر پختونخوا میں اردو پشتو ہندکو اور گوجری ادب رو بہ ترقی ہے۔ مردان کے تنقیدی ثمرات بھی سامنے آرہے ہیں۔ جو خوش آئند بھی ہیں اور مبارک قدم بھی۔

بلقیس ریاض صاحبہ اور سیما پیروز صاحبہ کے افسانے 'خاص' دلچسپی سے پڑھے۔ ہماری خواتین افسانہ نگار خاص خاص، موضوع پر استوار افسانے سپردِ قلم کرتی ہیں۔ سیما پیروز کا افسانہ ''زبیدہ لاج'' نسوانی بے بسی اور اپنے کو لیے دیئے انداز کا نوحہ ہے۔ اولاد کے بیرون ملک اڑنچھو ہونے کا درد ڈیرے کے شاعر سعید احمد اختر کے اس شعر میں دیکھیے:

چکور خوش ہے کہ بچوں کو آ گیا اڑنا
اداس بھی ہے کہ رُت آ گئی بچھڑنے کی

شوکت علی شاہ صاحب 'شاہ داستان' میں دلچسپ مگر بے تعلق انداز سے ملک کی سیاست اور نظامت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ شاہ داستان کی قسطوں میں ذاتیات، سماجیات اور سیاسیات کے متعدد پہلو سامنے آرہے ہیں۔ ہمارے سیاست دان سامنے کچھ اور پسِ پشت کچھ کے آہنہ بند ہیں۔ خطوط میں آفتاب احمد صاحب نے مجھے بصیغۂ اعزاز 'سرخ رُو' کہا ہے۔ یہ ان کی مہربانی ہے۔ وہ ہر بارنگہ میں رکھتے ہیں۔ محمد شفیق انصاری صاحب نے میری مانگی ہوئی محبت کو سراہا ہے۔ انھوں نے خوب نظر سے دیکھا انھیں 'دعا' کا ذکر بھی کیا۔ آپ گویا دوستی یار کا خیال رکھتے ہیں۔ رسالے میں ایک یہ شعر دل کو لگا:

طویل چپ سے بناتے ہیں رات بھر خود کو
پھر ایک چیخ سے خود کو مٹا کے روتے ہیں

اعجاز رضوی صاحب کا قلم بقولے دور کی 'کوڑیاں' لاتا ہے وہ ہنساتے بھی ہیں اور شرمندہ بھی کرتے ہیں۔ علی اصغر عباس صاحب سے متعلق ان کی باتیں کمال کی ہیں۔ علی اصغر عباس محتاط اور پُروقار ہیں۔ لاہور میں میری کتاب در کنار کی تقریب

ہوئی وہ تقریب کے بعد مارے محبت کے دیر تک میرے پاس بیٹھے رہے۔ ان کی محبت بھری باتوں سے میں ثقلِ سماعت کی وجہ سے مستفید نہیں ہو سکا۔ ان کی نگاہوں کی اخلاص مندی میں نے ہر طور محسوس کر لی تھی۔ آخر پر 'بیاض' کی ادب پروری، ادب شناسی اور ادب نگاری کو سلام۔

جمیل یوسف

عزیز محترم جناب عمران منظور صاحب!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

ماشاء اللہ۔ نظر بد دور۔ 'بیاض' نے یکم جنوری کو ہی آ کر نئے سال کی مبارک باد دی۔ اللہ ہمارے اس ساتھی کو جو ہمارے لیے ہر ماہ مسرت و شادمانی کا سندیسہ لے کر آتا ہے، صحیح و سلامت رکھے۔ 'بیاض' نے کئی نئے ریکارڈز قائم کر دیے ہیں۔ ادبیات اور قومی زبان جیسے سرکاری و نیم سرکاری ادبی جرائد کو چھوڑ کر غالباً 'بیاض' پہلا ادبی جریدہ ہے جو دنیا بھر میں اردو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اب انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے۔ پھر یہ آپ کی محنت اور مسلسل کاوش سے پاکستان کا سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ بن چکا ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ 'بیاض' کا سرورق ہر ماہ مصوری کا ایک خوبصورت اور دل آویز نمونہ قارئین کے سامنے لاتا ہے۔ 'ادبِ لطیف' اور 'فنون' کا سرورق بھی خوبصورت ہوا کرتا تھا مگر اب تو یہ رسالے چھ چھ ماہ تک شائع ہی نہیں ہوتے۔ شاید ماہنامہ 'بیاض' ہی ملک کا واحد ادبی رسالہ ہے جو باقاعدگی سے ہر ماہ کی پہلی یا دوسری تاریخ کو قارئین کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ مجھ جیسے قارئین کو تو نئے مہینے کی آمد کی خوشی ہی اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ 'بیاض' کا دیدار ہو گا۔ 'بیاض' کا چوتھا اعزاز اور خصوصیت یہ ہے کہ ہر ماہ نئی مطبوعات کے سرورق کی خوبصورت تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ ایک طرح کا نئی کتابوں کا تصویری خبرنامہ ہے جو اہلِ قلم کے لیے فی سبیل اللہ کثیر الاشاعت اشتہار کا کام دیتا ہے۔ 'بیاض' کی پانچویں امتیازی حیثیت یہ ہے کہ آج تک کسی ادبی رسالے کے عام شماروں میں اتنی کثیر تعداد میں شاعروں اور شاعرات کو جگہ نہیں ملی جتنے شاعر اور شاعرات کا کلام 'بیاض' اپنے دامن میں لے کر آتا ہے۔ ساتھ ہر لکھنے والے کی تصویر بھی ہوتی ہے کہ صورت ببیں حالم مپرس۔ کیونکہ حال تو صورت سے بھی ظاہر ہے اور تحریر سے بھی۔ گویا کہ اس میں شامل ہر اہلِ قلم سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ سلامت رہیں اور خوش رہیں۔

اے وقتِ تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی

نسیم سحر

برادرم عمران منظور اور بیاض کی ساری ٹیم۔ السلام علیکم۔

نیا سال مبارک، اگرچہ گذشتہ دو تین دن سے کوہ مری اور گلیات میں برف و باراں کے شدید طوفان سے جو تباہی ہوئی اور کئی انسانی جانیں ضائع ہوئیں وہ اس سال کی کوئی اچھی ابتدا تو نہیں ہے مگر اس کے باوجود رب تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ ہمیں اپنے امن و امان کی پناہ میں رکھے۔ آمین۔ کرونا کی سوتیلی بہن اومی کرون بھی ایک اور مسئلہ ہے جس کے بارے میں تا حال کسی کو زیادہ آگاہی بھی نہیں اس لیے متضاد خبریں پھیل رہی ہیں۔ اس سے بھی اللہ تعالیٰ سب کو محفوظ رکھے، اور ایک آخری دعا یہ کہ خدایا پاکستانی قوم کو مہنگائی اور آئی ایم ایف کے چنگل سے بچ نکلنے کی کوئی تدبیر سجھائے۔

دعائیہ انداز کچھ طویل ہو گیا اب بیاض کے ۲۰۲۲ء کے اولیں شمارے پر کچھ باتیں ہو جائیں۔ حمد و نعت کے کچھ بہت چیدہ اشعار:

رزق دیتا ہے وہ پتھر میں بھی کیڑے کو کمال
پیٹ بھرنے کا پرندوں کو ہنر دیتا ہے
(اشرف کمال)

نبیؐ کا معجزہ شق القمر کا
حقیقت ہے، در حقیقت در حقیقت
(آصف ثاقب)

کھڑی ہوں میں روضے کی جالی سے لگ کر
میں خوشبو ہی خوشبو سمیٹے کھڑی ہوں
(رخشندہ نوید)

افسانوں پر تبصرہ نہیں کر رہا اگرچہ سب پڑھے بھی اور اچھے بھی لگے۔ مگر تبصرہ کرنے میں خط طویل ہو جائے گا۔

مضامین میں جناب محمد ارشاد کا مضمون "شہر استان" ایسا تحفہ گویا پڑھنے کی چیز ہے، تو اسے بار بار پڑھئے۔ ایسی دانش کی باتیں جو بعض اوقات موضوعات کی گرفت سے تو باہر بھی ہو جاتی ہیں مگر دانش و علم کے دائرے میں رہ کر قاری کو اپنی گرفت میں رکھتی ہیں۔ ادب، سیاست، معیشت، علمی و غیر ملکی تاریخ سبھی کچھ اس میں شامل ہیں۔ اسی طرح برادرم خورشید ربانی نے قضا روحی (قاضی محمد عمر خان) کے بارے میں جو لکھا ہے وہ اردو ادبی تاریخ میں ایک اہم انکشاف بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ اس باکمال شاعر کا جتنا کلام خورشید ربانی نے لکھا ہے، وہ سارا ان کی قلمی بیاض سے حاصل کیا ہے گویا اہلِ ادب اور اہلِ نظر سے یہ مضمون آنے تک وہ اوجھل ہی رہے۔ برادرم ہارون الرشید نے پروفیسر جلیل عالی کی کتاب "شعری دانش کی دھن میں" پر بڑا خیال افروز مضمون لکھا ہے، یہی کتاب مجھے بھی برادرم جلیل عالی نے عطا کی ہے مگر تا حال اس کا تفصیلی مطالعہ نہیں کر سکا۔ ہارون الرشید کے مضمون سے اس شعری دانش کی خوشبو مجھے کافی حد تک معطر کر گئی ہے۔ جناب شاہد اشرف نے اپنے مضمون "شعراء کے رجحانات" میں شعراء کے عمومی رجحانات اور موضوعات پر کڑی گرفت کی ہے اور شاعری کو 'راہِ راست' پر لانے کے لیے کچھ مشورے اور ہدایات بھی دی ہیں جن سے کچھ شعراء کا متفق ہونا ضروری اور سب شعراء کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ خاص طور پر انھوں نے جس پیرائے میں نعتیہ شاعری کا ذکر کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے: "نعتیہ حلقوں کو مذہبی حمایت حاصل ہے اس لیے نعت خوانی اور نعت گوئی کو مسلسل تقویت مل رہی ہے۔ اشرافیہ کا ان سے کوئی خدشہ نہیں"، وہ کسی حد تک محلِ نظر ہے۔ کوئی نعت گو شاعر شاید ہی سیاسی یا مذہبی حلقوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے لکھتا ہو۔ اس جذبے میں عشقِ رسولؐ کو ہی بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ویسے بھی نعت گوئی اور نعت خوانی کا احاطہ الگ الگ کرنا چاہیے تھا۔

اب غزلوں کے کچھ عمدہ اشعار کا ذکر کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

وقت مت تحلیل مری طرح مری ذبدھا میں
خوفِ رسوائی کہاں ، حسرتِ تشہیر کہاں
(خالد احمد)

آئینہ کلام کر رہا ہے
اے میرے جنوں ، پلک نہ جھپکا
(خالد علیم)

رقص شعار ہو گئے، رزق مدار ہو گئے
ہم تو فقط حصار تھے ، مرکزِ ثبات کے
(خالد احمد)

ہماری قبر پہ اک تتلی تھی محبت کی
اگر ہو یاد تجھے، پھول بھی کھلا ہوا تھا
(اقبال سروبہ)

کھیل سے ہی نہ کہیں تم کو نکلنا پڑ جائے
اتنا کردار کرو جتنا تھایا ہوا ہے
(جلیل عالی)

میں کائنات کی حد سے نکلنا چاہتا ہوں
فسونِ یار! مجھے اس طرف کو جانے دے
(اسحاق وردگ)

شعر کہنا کوئی آسان نہیں میرے نقاد
ہم تری طرح سے پنسل نہیں گھڑتے رہتے
(خاور اعجاز)

کیا کریں سیر جا کر تاظر کے قطبین میں
ان دنوں تو وہاں کا بھی موسم بڑا گرم ہے
(شاہدہ دلاور گلی)

سب سے پہلے وہی شکار ہوئے
جن پرندوں کو تھا شجر کا خیال
(باقی احمد پوری)

تمہارے زخم سے میری رضا بندھی ہوئی ہے
تمہاری ذات سے مشروط ہیں عیوب مرے
(نعیم رضا بھٹی)

بس دکھی لوگ یاد رکھتے ہیں
دل کسی پیر کا مزار ہوا
(احمد محمود)

پھر دسمبر کی سرد شامیں ہیں
دل ہوا بے قرار پہلا سا
(طلعت شبیر)

دل کا ماتم دماغ میں جب ہو
یار، بس ایک رگ ہی پھٹتی ہے
(ماریہ مجور)

وہی کوزہ تھا سب سے بیش قیمت
جو عجلت میں بنایا جا رہا تھا
(احمد رضا)

یہ دیکھ کر حیرت نما مسرت ہوئی کہ اس شمارے میں شامل نظمیں بھی معیار اور عمدگی میں غزلوں سے کسی طور کم نہیں۔ امجد اسلام امجد، جمیل یوسف، گلزار بخاری، شاہد حسن، خالد علیم، درخشندہ نوید اور طالب انصاری کی نظموں نے خاص طور پر تادیر متوجہ کیے رکھا۔ جناب جمیل یوسف کی نظم 'رائی' اس سے پہلے بھی کسی جریدے میں بطور غزل نظر سے گزر چکی ہے، وہاں بھی یہ غزل مسلسل پڑھ کر یہی احساس ہوتا رہا کہ یہ غزل سے زیادہ نظم کے پیرایے میں اچھی لگے گی۔ شاید جمیل یوسف صاحب نے کسی ٹیلی پیتھک رابطے کے ذریعے میرے دل کی بات جان لی اور اب اسے نظم کا پیرہن عطا کر دیا۔

خط کے آخر میں دو اہم خبریں۔ مختلف حمد و نعت کے مجموعوں پر میرے دیباچوں، تقاریظ اور مضامین کا مجموعہ کل ہی کراچی سے "تقاریظ و مضامینِ حمد و نعت" کے عنوان سے شائع ہو کر آ گیا ہے اور ان شاء اللہ جلد ہی اس کے دو نسخے آپ کو ارسال کروں گا۔ دوسری خبر یہ کہ میں نے کچھ دن قبل خاص طور پر اکادمی ادبیات جا کر پاکستانی ادب کے معمار سیریز میں جناب آصف ثاقب کی شخصیت و فن پر ایک اور صاحبِ کمال ادیب و نقاد جناب احمد حسین مجاہد کی لکھی ہوئی کتاب حاصل کر لی ہے اور ان دنوں اسے پڑھ کر جناب آصف ثاقب سے مزید شناسائی حاصل کر رہا ہوں، اس پر اپنے تاثرات بھی یہ قبل مکمل ہونے کے بعد تحریر کروں گا ان شاء اللہ۔

خط اختصار کے اعلان کے باوجود کچھ طویل لگ رہا ہو تو اس کی معذرت۔ اللہ حافظ

ممتاز راشد لاہوری

محترم عمران منظور، محترم اعجاز رضوی

تسلیمات!

"بیاض" (جنوری 2022ء) دست و نظر نواز ہوا۔ حسب روایت دلکش تحریروں سے آراستہ شمارہ ثابت ہوا۔ خالد احمد کی "دستک" سے اگلے اوراق کا دروازہ کھلا۔ حمد و نعت کے بابرکت صفحات سے خوشبوئیں کشید کیں۔ نسیم سحر اور خاور اعجاز کے عمدہ ہائیکوز سے حظ اٹھایا۔ بلقیس ریاض اور سیما پیروز کے افسانوں کا مطالعہ کیا اور کئی افسانوی کیفیات کو نظروں میں سمیٹا۔ شوکت علی شاہ کی "آپ بیتی" کے حالیہ قسط نے بہت محظوظ کیا۔ انھوں نے رحیم آباد (تحصیل صادق آباد)، بھونگ، مٹھن کوٹ اور رحیم یار خاں وغیرہ کے پس منظر میں کئی تاریخی واقعات بھی قلمبند کیے ہیں اور کئی یادوں کو مہمیز لگائی ہے۔ کیسی کیسی سیاسی شخصیات سے انھوں نے ملاقات کرا دی ہے۔ زبردست...... شاہد اشرف نے عصرِ حاضر کے شعرا کے رجحانات کے بارے میں اچھا مضمون لکھا ہے۔ انھوں نے نعت گو شعرا اور مزاحیہ شعرا کو آج کل زیادہ کامیاب بتایا ہے اور مزاحمتی شعرا کی کمیابی پر دکھ کا اظہار کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ انھیں اپنے ایسے کسی مضمون میں اس موضوع کے اور بھی پہلو بیان کرنے چاہئیں۔

محمد حنیف کے مضمون 'فیض احمد فیض' میں اس عظیم شاعر کی زندگی اور ان کی وفات کے بعد کے 'جشنِ فیض' منانے کی کچھ تصویریں پیش کر کے کمال کا کام کیا ہے۔ 'بیاض' کے اس شمارے میں اور بھی اچھے مضمون پڑھنے کو ملے اور رنگا رنگ شاعری بھی۔ آپ نے میری بھی دو غزلیں شامل کی ہیں اور میرا خط بھی، دلی شکریہ۔

خطوط میں نسیم سحر کا خط کافی مفصل ہوتا ہے اور پُر مغز بھی۔ آصف ثاقب، کرامت بخاری، آفتاب احمد ملک، طالب انصاری، شفیق انصاری اور اشرف کمال کے خطوط بھی خوب تھے۔

آفتاب احمد ملک

عزت مآب برادرم عمران منظور صاحب، ایڈیٹر ماہنامہ بیاض

سلام نیاز مندانہ!

سالِ نو 2022 کا ابھرتا رنگین ٹائٹل کے ساتھ مرغوب و مقبول ماہنامہ بیاض بھی یکم جنوری 2022 کے سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی بروقت نظر نواز ہوا۔ ممنون ہوں۔ عمرِ عزیز کا ایک سال "تانا بانا" بیت گیا۔

حمد و نعت کے بعد طبعاً آنجہانی شاہ داستان پہلے پڑھی۔ شاہ صاحب بیوروکریسی و سول حکومتی ٹولے کی کارستانیوں کو اپنے مخصوص اندازِ تحریر میں قارئین کی ناقص معلومات میں گرانقدر اضافہ کرتے ہیں۔ ان کی عمر و صحت کاملہ کے لیے ہمہ وقت دعا گو ہوں۔

ایک مدت سے مستقل لکھاری (خواتین و حضرات، بیاض، کی ادبی محفلیں سے غائب ہیں، مثلاً ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ (لاہور)، اسعد عباس خان (ساہیوال، سرگودھا) جسارت خیالی (بہاؤ پور مظفر گڑھ) اور سلیم اختر ندیم (لیہ) گمشدگی کا اشتہار دینے سے قاصر ہے۔ اپنی نگارشات و تخلیقات بھیجنا نہ بھولیے گا۔

محمود شام نے برصغیر پاک و ہند کی معروف علمی و ادبی شخصیت سید فخرالدین بلے (مرحوم) کا تذکرہ کیا۔ (مرحوم) علمی و ادبی لائبریری تھے۔ حامد یزدانی نے لیاقت علی عاصم کی شاعری کے حوالے سے معلوماتی تنقیدی خاکہ لکھا۔ برادرم خورشید ربانی نے قتیل شفائی (مرحوم) کی شاعری، تاریخی ادبی پس منظر اور قدیمی روایات پر خاصی دلچسپ تحریر قارئین کی دلچسپی کے لیے خاصی اہم ہے۔ 16 حوالہ جات سے لگتا ہے گویا تحقیقی مقالہ ہے۔ ہم جیسے ادب کے طلباء کے لیے معلوماتی خزانہ بھی ہے۔ (احوال و آثار) ہارون الرشید نے جلیل عالی سے لے کر خالد احمد کی غزل، نظم تک کا سفر بعنوان "شعری دانش کی دھن میں" قلمبند کیا۔ اسلوب نگارش خوب ہے۔

محمد حنیف کا تفصیلی مضمون "فیض احمد فیض" پڑھا۔ سوانحی خاکہ، شاعری کے تناظر میں نقد اور اہل قلم کی آرا بھی درج کی ہیں (صفحہ نمبر 103-94) شاہد ماکلی ماہانہ دو نوخیز شعرا سے متعارف کراتے ہیں۔ حوصلہ افزائی اور ان کا بڑا پن ہے۔ شاعر امروز (صفحہ نمبر 194 - 190) اعجاز رضوی کا علی اصغر عباس، یوسف عباس اکادمی ادبیات کی تقریب میں پڑھا جانے والا ادبی خاکہ بیاض میں بھی شامل ہے۔ رضوی صاحب طنز و مزاح کے بادشاہ ہیں۔ لفظوں سے کھیلنا اور اہل قلم کی ادبی حرکات و سکنات کے کھوجی دوست ہیں۔

غزل گو شعرا کے تازہ کلام نے خاصا متاثر کیا۔ چند منتخب اشعار قند مکرر نذرِ قارئین ہیں۔

رنگ کس رنگ کے ڈھونڈوں کہ تجھے دیکھ سکوں
کون ہے اے کون! لکیروں تیری تصویر کہاں
(خالد احمد)

تحریر میں ضد کا شائبہ تھا
مکتوب کسی نے یوں لکھا ہے
لفظوں کے وہ جوڑے ہیرے موتی
جو شخص ہمارا بادشہ ہے
(آصف ثاقب)

وہ جو رمز تھی وہ کھلی تو ہے بڑی دیر سے ہے مگر کھلی
یہی زندگی کا اصول ہے، بڑی بے اصول ہے زندگی
(احمد اسلام امجد)

کتابوں میں بھلے جیسی بھی تم تاریخ لکھو
دلوں پہ وقت خود تحریر ہوتا جا رہا ہے
(جلیل عالی)

اپنے شعروں میں سانس لیتا ہوں
لگ گیا اس ہنر کو جب میں تو؟
(نسیم سحر)

شعر کہنا کوئی آساں نہیں میرے نقاد!
ہم تیری طرح سے پنسل نہیں گھڑتے رہے
(خاور اعجاز)

حرمت لفظ ہے گراں مایہ
رشک آتا ہے سچے حرفوں پر
(سید ریاض حسین زیدی)

سب سے پہلے وہی شکار ہوئے
جن پرندوں کو تھا شجر کا خیال
(باقی احمد پوری)

دعا کرو کہ پہاڑوں پہ برف گرتی رہے
زمیں وہیں رہے گی زکوٰۃ پانی کی
(اعجاز کنور راجہ)

شاخ سے ٹوٹنے پتے ہی بتا سکتے ہیں
ہجر کیا چیز ہے اور اصل میں ہجرت کیا ہے
(ممتاز اطہر)

جگ میں زندہ ہیں وہ سدا جن کے
تذکرے صبح شام رہتے ہیں
(رشید آفرین)

رو رو کے میں نے لفظ لکھے لوحِ زیست پر
شیون کا شور شعر کا اصلی شباب ہے
(کرامت بخاری)

تمھیں ہو یاد کہ اک شاخ سبز تھی جس پر
تمھارے آنے سے اس پھول بھی کھلا ہوا تھا
(اقبال سروبہ)

جسم کے زندان سے آزاد کوئی ہو گیا
یار مسجد میں کسی کی موت کا اعلان ہے
(انور حسن)

جیسے لب ، ہیں ترے تو بول فقط
تجھے انداز یاں سوچنا کیا
(حسنین سحر)

اک خواب تھا ، میں جس کو نہ تعبیر دے سکا
ذہنوں پہ منکشف تھا ، زباں پر نہ کھلا
(محمد نوید مرزا)

فر فر تصویر بولتی ہے
حیرت سے گنگ سامری ہے
(شہاب صفدر)

شہر بھر میں سبھی فرشتے ہیں
شہر بھر میں عجیب ڈر سا لگا
(شوکت محمود شوکت)

بچ ہی جاتی ہے جب اپنے قلم کی حرمت
جھوٹ سب ملک کے اخبار پہ آ جاتے ہیں
(عقیل رحمانی)

وہ ہیں کہ پرندوں کو بھی جینے نہیں دیتے
میں ہوں کہ فقط پیڑ اگانے میں لگی ہوں
(زیب النساء زیبی)

دیکھنا پھر سے آئے گا طوفان
چند شاخوں پہ گھونسلے ہیں ابھی
(احمد جلیل)

باغ سے پھول توڑنے والا
چاہے تو دل بھی توڑ سکتا ہے
(عمران اعوان)

لکھتا رہوں گا شعر اسی شوق سے حکیم
چھپ جائے گی کتاب مرے بعد دیکھنا
(حکیم خان حکیم)

شاخ در شاخ بہت خوش ہیں پرندے لیکن
ان کو معلوم نہیں جال بھی تبدیل ہوا
(اسد اعوان)

ہجر میں جس قدر سکون ملے
وصل میں وہ مزا نہیں ہوتا
(آفتاب خان)

یہ روشنی مری تہذیب کا ہی حاصل ہے
میں کیسے حلقہ احباب سے نکل آؤں
(روہ ندروی)

سانحہ کوئی ہمیں تاک نہیں سکتا ہے
ہم ہیں محفوظ محبت کے حسیں ہاتھوں میں
(جیا قریشی)

ہمارے جسم لعنت ہیں یہی قبروں کے
ہماری یاد میں ساجد اداس بڑھنے لگے
(ساجد رضا خان)

نظموں کے نئے عنوانات پڑھ کر نظم کو شعرا کو داد دینا اخلاقی و ادبی فرض ہے۔ مثلاً رائی

میں جسے آج تک سمجھ نہ سکا
تم محبت کی وہ بھارت ہو

دھیان جس کا طواف کرتا ہے
دل کی نگری میں وہ زیارت ہو

جمیل یوسف

10 خطوط و دستوں کی خیر و عافیت کے عکاس اور 8 نئی کتابوں کے رنگین سرورق دیکھ کر ادبی طمانیت ہوئی۔ 241 صفحات ادبی کمالات کے غمازی ہیں۔ "بیاض" کی متحرک ٹیم کو سال نو مبارک ہو۔ ماہانہ تحریروں کے انتخاب پر سلام مؤدبانہ!!

فیض رسول فیضان

محترم مدیران بیاض! آداب و تسلیمات!

دسمبر کا شمارہ نظر نواز ہو کر دلنواز ٹھہرا ہے۔ سرورق تجرید و تجسیم کا خوش گوار سنگم ہے۔ پچھلی ورق پر احباب کی تصاویر دلپذیر سے گویا نصف ملاقات کا سامان ہو گیا۔ دونوں (فرنٹ اور بیک) ٹائٹلوں کے اندرون میں تازہ کتب کی اشاعت کا اعلان، معلومات افزا ہوتا ہے۔

حضرت ارشاد صاحب سے تاثراتی و تبصرہ جاتی مکتوبات کے ساتھ ساتھ غالب و اقبال کے فلسفہ اور فنی نقد فلسفے پر باضابطہ مضامین بھی لکھواتے رہا کریں۔ اُن کی ذات علم و ادب کا سمندر اور شعر و سخن کا خزانہ ہے۔ خالی ڈھولوں سے گھسی پٹی اور پھٹی پرانی خود ستائی آوازیں آیا کرتی ہیں مگر موصوف مکرم کا معاملہ یکسر مختلف ہے۔ عجز و انکسار سے اُن کے تبحرِ علمی کو واقعی چار چاند لگ جایا کرتے ہیں۔ آج کے اونچی دوکان پھیکا پکوان والے ادبی منظرنامے میں اُن کا وجود بہت غنیمت ہے۔ مالک اُن کو عمر دراز اور مزید عزت و برکت سے نوازے (آمین)۔

دعوے سے یہ بات کہی جاسکتی ہے اور تسلیم کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ عہدِ حاضر میں صرف اور صرف 'بیاض' ہی وہ واحد ادبی پرچہ ہے جو میرٹ کی عملی پاسداری کا امین و مظہر ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت خالد احمد کا لگایا ہوا یہ پودا حضرت احمد ندیم قاسمی کی دعا برکت سے اب ایک پھلدار، خوشبودار اور سایہ دار درخت بن چکا ہے جبکہ دیگر کئی ایک پرچے وسائل کی فراوانی کے باوجود، فتور نیت، غلط بخشیوں اور اقربا پروری کے باعث غتربود ہو کر قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔ 'بیاض' کے دوام و تسلسل کا سہرا بلاشبہ عمران و نعمان و اعجاز صاحبان اور دیگر ادارتی رفقا و معاونین کے سر سجتا ہے۔

اللہ کرے حُسنِ عمل اور زیادہ

یوں تو حمد و نعت، نظم و غزل اور افسانہ و مزاح کے گلہائے رنگ برنگ سے مزین اس گلدستۂ ادب کے اکثر مشمولات حسب معمول، معیاری و متاثر کُن ہیں تاہم مکتوبی تبصرے میں تفصیل کی عدم گنجائش کے سبب چند چیدہ چیدہ اشعار کے اعادے پر اکتفا کرتا ہوں کہ بقول حالی:

بیا ہے لیجئے جب نام اُس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

یاد رہے کہ ان لطیف و بلیغ شعروں کو دہرانے کا قطعاً اور ہرگز یہ مطلب نہیں کہ بقیہ اشعار معمولی ہیں۔ جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں:

ہر ذرہ آفتاب ہے اپنے مقام پر

نجیب احمد کی کلیات کی اشاعت پر دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔ اگر "بیاض" کا نثری و منظوم انتخاب بھی وقتاً فوقتاً چھپنا شروع ہو جائے تو سونے پر سہاگہ ہو جائے۔

منتخب شعری پھولوں کی ڈالی، ارباب ذوق کو پیش خدمت ہے۔

بے سر و سامان ہونے سے سرا سر بچ گیا
جس کا ہے دل سے عقیدہ، تو ہے واحد دستگیر
(سید ریاض حسین زیدی)

زیست دہراتی ہے حق ہُو حق ہُو
موت دیتی ہے خبر، الا اللہ
(شباب صفدر)

تجھ سے کچھ بھی نہیں ہے پوشیدہ
سب غیاب و حضور تیرا ہے
(سرور حسین نقشبندی)

ہر قدم جنتِ گم گشتہ کی جانب اُٹھا
کس بلندی پہ وہ انسان کا مقدر لائے
(حسن عسکری کاظمی)

رہگزارِ جہاں میں یاد اُن کی
آبِ کوثر کی جیسے چھاگل ہو
(محمد یٰسین قمر)

کلامِ پاک ہے سیرت رسولِ اکرم کی
رسولِ پاک کا فرماں بیانِ رحمت ہے
(خورشید ربانی)

محسن ورد! میرے آقا کے در کے ہو جاؤ
خرد کو ملتی ہیں دانائیاں مدینے میں
(محسن اسرار)

چھوتا ہے آپ کے قدموں کی مٹی آسماں
ماورا ہے آپ کی رفعت حدِ ادراک سے
(غلام حسین ساجد)

میں کہہ رہا ہوں کہ اُن سا کہیں نہیں کوئی
میں کہہ رہا ہوں کہ اُن کی مثال ہے ہی نہیں
(اظہر حسن)

جو راہِ حق تھی ، جو وحدت کی راہ تھی ہم کو
اُس ایک راہ پہ ڈالا حضورؐ نے آ کر
(محمود کیفی)

وہ تاجدارِ مدینہ کے اک غلام کی ہے
جو بامِ کعبہ پہ گونجی تھی اک اذانِ حرم
(مرزا آصف رسول)

جانے کیا پھونک کر فسوں آتی ہے
ہر روز نیا کر کے جنوں آتی ہے
ایوان سے آ رہی ہے مقتل کی صدا
دربارِ شہی سے بوئے خوں آتی ہے
(خالد علیم)

گاؤں کی دم ساز
گہری نیند کے عالم میں
جھرنوں کی آواز
(خاور اعجاز)

عرفانِ فن ذرا ہوا حاصل ہمیں تو ہم
اظہارِ ذات میں بڑے بے باک ہو گئے
(خالد احمد)

وقتِ رخصت بھی عطا کرتا
ایک آنسو ہماری قیمت ہے
(آصف ثاقب)

تمہارا بس نہیں چلتا وگرنہ شہر سارا
چڑھا دیتے صلیبوں پہ سپردِ دار کرتے
(جمیل عالی)

میں قصۂ غم کس کو سناؤں یہ بتا دے
اپنوں نے مری بات نہ مانی مرے مولا
(حسن عسکری کاظمی)

راحتیں اُس کے پاؤں پڑتی ہیں
آزمائش سے جو گزر آئے
(سید ریاض حسین زیدی)

ہر نظریہ ہے آزمائش میں
ہر علامت ہے انتشار میں گم
(محسن اسرار)

کیسے کہہ دوں کہ مرے پیچھے پڑی ہے دنیا
میرے اعمال میرے سامنے آئے ہوئے ہیں
(خاور اعجاز)

رنگ و بو کے سلسلے ہیں اور بھی
اِس جہانِ رنگ و بو کے اُس طرف
(نسیم سحر)

جیتنا ہار مقدر ہے
تم نہ جیتے کبھی نہ ہارے ہو
(بشیر رزمی)

یہ بھید کھلا معرفتِ شام و سحر سے
دن شب سے جدا ہے ، نہ الگ عیب ہنر سے
(خالد احمد)

سچ کی خاطر جو دار پر جھولیں
حوصلے اُن کے باخدا دیکھیں
(رشید آفرین)

آج بھی رکھی ہوئی ہے وہ لگا کر دل سے
میں نے تصویر جو کھینچی تھی لبِ جُو اُس کی
(راحت سرحدی)

خدا کے بندوں کو تم سبز باغ دکھلاؤ
ہمارے واسطے ہے یہ محال البتہ
(سید ضیاء الدین نعیم)

شہروں سے نکالا انہیں مسموم فضا نے
ملتے ہیں درخشندہ مضافات میں جگنو
(گلزار بخاری)

آنکھوں آنکھوں میں کٹی جو شبِ ہجراں شوکت
یاد پھر آئی ہمیں دل کی لگی آخرِ شب
(شوکت محمود شوکت)

رات بھر عرضِ تمنا ، صبح کو فکرِ معاش
ہر گھڑی گزری ہے مجھ پہ امتحانوں کی طرح
(یونس خیال)

ہر روز نئے روپ میں ملتے ہیں مرے یار
آ جاتے ہیں ہر روز نئے سانچے میں ڈھل کر
(اکرم نصر)

دل اتنا خوش تو نہیں تھا
کیا اس کی وفات ہو گئی ہے
(سید قاسم جلال)

محبتوں سے مجھے حکومت ملی نہیں ہے
میں صاحبِ اقتدار ہونے سے رہ گیا ہوں
(اقبال سروبہ)

فقیرِ راہ دعاؤں کی شکل میں اب بھی
طرح طرح کی دوائیں اٹھائے پھرتا ہے
(فرحت عباس)

کسی کو تا ابد خوش دیکھنا تھا
ہمیں آخر اجڑنا پڑ گیا تھا
(تصور اقبال)

دوپہر آئی ہمیں اجنبی چوراہے پر
اپنا سایا بھی نہیں ہے جسے اپنا کہہ لیں
(حمیدیزدانی)

خوش فہمیوں کو پالنا آسان کام ہے
ہم لوگ حُسن و خوبی سے یہ کام کر گئے
(علی اصغر عباس)

اب کیا تمہیں بتائیں کہ کب خاک ہو گئے
تب پوچھنے کو آئے ہو جب خاک ہو گئے
(افضل گوہر)

وہ لب دکھا رہے تھے کسی خواب کی بہار
وہ آنکھ کر رہی تھی اشارے میں گفت گو
(شہاب صفدر)

نجانے کس گھڑی ہو جائے ملتفت وہ کریم
تم التجاؤں کا دامن پسارتے رہنا
(ذکی طارق)

ہم صبح کے بھولے ہوئے وہ لوگ ہیں جن سے
گھر شام کو بھی لوٹ کے آیا نہیں جاتا
(احمد جمیل)

کوئی دستار ہو کہ ہو دیوار
گر رہی ہو تو کب سنبھلتی ہے
(کرامت بخاری)

خواب میں بیٹھا ہوں اک اونچی جگہ
دل پریشاں ہے مرا کل رات سے
(سحر تاب رومانی)

ان کنایوں کو سمجھنا ہر کسی کا بس نہیں
میرے کہنے کا ہے یہ مطلب خلاصہ کھول دے
(یعقوب پرواز)

اب اور مجھ سے چاہئے کیا اے مرے عزیز
سر پر بھی ہاتھ رکھ دیا، دل سے دُعا بھی دی
(قمر رضا شہزاد)

جس نے جانا ہی نہیں راز مری باتوں کا
وہ مرے خواب خیالوں سے سمجھتا ہے مجھے
(نیلما ناہید درانی)

صرف تھوڑا سا انہیں غصہ دلا دیتا ہوں میں
خود بنا لیتی ہے ماتھے پر شکن اپنی جگہ
(بدر منیر)

تیری تصویر میں رنگوں کی دھنک بھر دیتا
مجھ کو کچھ دیر جو رکنے کی اجازت ملتی
(اشرف کمال)

ہمارے سر سے کبھی غم کا آسماں نہ ہٹا
بدل کے دیکھ لی بستی، مکان بھی بدلے
(رخشندہ نوید)

خود کو گرنے سے کئی بار سنبھالا میں نے
ایک لغزش کو مگر سارا جہاں جانتا ہے
(شاہد اشرف)

وہاں نور پھیلا ہوا ہے خدا کا
نشانی ہے یہ بہتریں آسماں کی
(آفتاب خان)

جس کو آنکھوں نے کبھی دیکھا نہیں
عمر گذری ہے اسی کے ذکر میں
(محمد نوید مرزا)

مرے ہنر کی مجھے داد دیجئے صاحب
اداسیوں سے مسرت کشید کرتا ہوں
(ہمایوں پرویز شاہد)

بینک بیلنس نہ کوئی گاڑی تھی
کیسے شہرت خرید لیتا میں
(ارشد محمود ارشد)

میں تو اک گم شدہ خزانہ ہوں
زندگی میں تلاش کر مجھ کو
(رومانہ رومی)

بچے بھی مرے ساتھ دُعا مانگ رہے ہیں
اے کاش مرے شہر کے حالات بدل جائیں
(ریاض ندیم نیازی)

مقید کر کے رکھی ہے زباں دانتوں کے پہرے میں
یہاں سچ کہنا مشکل ہے نتیجہ سوچ سکتا ہوں
(دانش عزیز)

جیت یوں بھی مجھے پسند نہیں
اچھی لگتی ہے اُس کو مات میری
(شاہد فرید)

مریض و چارہ گر نادان سارے
دوا بن کر قضا پھیلی ہوئی ہے
(فیض رسول فیضان)

ساتھ تیرے جو تھا ہوا پہلے
وہی اس بار ہونے والا ہے
(زبیر فاروق)

ایک نکتے پہ مل گئے دونوں
ہجر کا دائرہ بناتے ہوئے
(عاصم اعجاز)

دھڑکن کی لے پہ ساز سے بجتے چلے گئے
ساتوں سُروں کا حسن تھا اُس کے کلام میں
(اکرم جاذب)

شاید کہ اس گلی سے گذر اس کا ہو کبھی
دل منتظر ہے آج بھی دیوانگی کے ساتھ
(شبانہ عشرت)

دریا تو اپنے زور سے مجھ کو ڈبو چکا
لہروں کے ساتھ ساتھ مجھے اب بہائے عشق
(وسیم حیران)

ہے مہنگائی نے یوں گھیرا ہوا چاروں طرف سے
گذارہ کر رہا ہے ہر کوئی نان جویں پر
(سرور فرحان)

اُس نے کہا کہ تم سے محبت ہے آج بھی
اور اس کے بعد فون کا نمبر بدل گیا
(عدنان خالد)

جس نے خاموش نگاہوں سے گذارش کی ہے
وہ تری راہ کی دیوار بھی ہو سکتی ہے
(افتخار شاہد)

جب بغاوت ہوئی تھی زنداں میں
عین اُسی دن مری رہائی تھی
(احمد حسین مجاہد)

ہر گھڑی ورد ہو دُعائے قنوت
زندگی شام کا سیارہ ہے
(عزیز عادل)

سب سے زیادہ دیکھی گئی چیز خواب ہیں
سب سے زیادہ بولا گیا لفظ کاش ہے
(شاہد ماگل)

سب کی چاہت کمال ہو گئی مگر
ماں کی سب سے جدا محبت ہے
(سید فرخ رضا ترمذی)

دشت میں دم توڑتی خلقِ خدا
ہے یقیں حالات سے دوچار ہے
(مرزا سکندر بیگ)

دیکھ کر مزدور بچہ
زندگی سے میں ڈرا ہوں
(میتھو محسن)

ایک بس میرے مجھے کا ہی مذکور ہے کیا
جانے کتنی ہی جگہ آج ہوا آئی نہیں
(کاشف حسین غائر)

تحیر ایک حقیقت سہی مگر تیرا
یہ اتنی جلدی بدلنا سمجھ نہیں آیا
(صغیر احمد صغیر)

ہمیں نہ اپنی محبت میں کوئی قید کرے
ہمارے پاس قبیلے کی پاسبانی ہے
(فخر عباس)

روتی آنکھوں سے مسکرا دینا
اس ادا نے رلا دیا مجھ کو
(سید ضیا حسین)

تیری آنکھوں میں جو دیکھی
دریا میں گہرائی نہیں ہے
(بشیر احمد حبیب)

احساس بندگی کا اُسے دیر سے ہوا
غافل سکون ڈھونڈتا رہا
(حمید حیدر اعوان)

کھا چکا ہوں نت نئے دھوکے یہاں
اس لئے باریک بینی آ گئی
(شہزاد احمد شیخ)

مرا نصیب مجھے بے ثبات کر نہ سکا
کیا ہے تیرے تغافل نے بے قرار مجھے
(علی حسین عابدی)

مداریوں کے تعارف میں اتنا کہتا چلوں
بغیر کام دکھائے بھی نام بنتا ہے
(عزیز فیصل)

ہوا تذکرہ جو ترے گیسوؤں کا
مرے ساتھ اہلِ سخن ناچتے ہیں
(محسن رضا شافی)

میں نے کچھ کام ضروری ابھی نمٹانے ہیں
تیرا احسان مرے یار اگر جانے دے
(عمران اعوان)

یہ زخمی دل ستانے لگ گیا ہے
مزہ جینے کا آنے لگ گیا ہے
(کومل)

ٹوٹ جاتی ہے وہ شے جس میں نہ ہو کوئی لچک
کبھی حالات کے سانچے میں ہے ڈھلنا پڑتا
(سہیل یار)

شہر کا شہر بھٹکتا ہوا جاتا ہے کہاں
دھیان ہے اور طرف اور قدم اور طرف
(اسحاق وردگ)

جانے کیوں خواب دیکھتی ہوں میں
جانے کیوں خواب سا لگا ہے تو
(نائلہ راٹھور)

دھڑکنوں کو جگہ نہیں ملتی
کیوں مرے دل میں اس قدر ہے تو
(رخسانہ سمن)

حقیقت ہے کہ بینائی کا دھوکا
شجر ہے خاک پر سایہ کھڑا ہے
(عزم الحسنین عزمی)

کسی رخسار نے چھوا ہوا کو
گلوں میں جو عجب سی تازگی ہے
(شہاب اللہ شہاب)

آسمانوں کے اُس طرف کیا ہے
تو فسانے سنانے والا کون
(نوید صادق)

اشرف کمال

محترم عمران منظور، نعمان منظور صاحب
السلام علیکم
ماہ جنوری کا شمارہ سال نو کے ٹائٹل کے ساتھ ابھرتے ہوئے روشن سورج کی تصویر کے ساتھ ابھرا۔
آغاز میں جناب خالد احمد کی نظم ''دستک'' سرد ہواؤں کے الفاظ کے ساتھ موسم سرما کا منظر پیش کرتی ہے:

سرد ہوائیں
خون جلائیں
کاگ منڈیر سے اُڑ اُڑ جائیں
رستے تو ہیں نین بچھائے

حمد ونعت کے بعد افسانے، آپ بیتی، طنز و مزاح، خاکے اور مضامین موجود ہیں۔ مضمون میں ''سید فخر الدین بلے۔ بلے بھی بلے'' کے عنوان سے محمود شام انھیں ایک انجمن اور گھنا سایہ دار پیڑ قرار دیا۔
غزلوں میں درج ذیل اشعار نے فوری توجہ حاصل کی:

عجیب سا کوئی راز ہے تہ بہ منکشف، نہ چھپا ہوا
کہیں تیرگی میں ہے روشنی، کہیں روشنی میں ہے تیرگی
(امجد اسلام امجد)

کھیل سے تو نہ کہیں تم کو نکلنا پڑ جائے
اتنا کردار کرو جتنا نبھایا ہوا ہے
(جلیل عالی)

میں سہولت سے مر بھی سکتا ہوں
دوست کرتے رہے تعاون تو
(نسیم سحر)

اور ناقدین پہ تنقید کرتے ہوئے خاور اعجاز لکھتے ہیں:

شعر کہنا کوئی آساں نہیں میرے نقاد
ہم تری طرح سے چپل نہیں گھڑتے رہتے

مشکل ہے زندگی میں اتارے گا سر سے تاج
لگتا ہے اس کی جان بھی جائے گی تخت پر
(گلزار بخاری)

اب اس کا قرب میسر ہو لازمی تو نہیں
ہے اس کے چاہنے والوں میں نام، کافی ہے
(ارشد شاہین)

ہم نے رکھے ہیں سرِ شام دیے مٹی میں
ہم سے پوچھے کوئی، مٹی کی محبت کیا ہے
(ممتاز اطہر)

وہ جس کے سائے میں تم نے دبا دیا تھا مجھے
میں آج پھر اسی بوڑھے شجر سے نکلا ہوں
(اوصاف شیخ)

میں قلم کو زباں سمجھتا ہوں
ہاتھ میرے ابھی قلم تو نہیں
(کرامت بخاری)

جل پڑے ہیں نیند میں بھی
پھر اک خواب کے آنے تک
(آسناحمد کنول)

آئنہ دل اور ستارہ ٹوٹ کر
جڑ نہیں سکتا دوبارہ ٹوٹ کر
(راحت سرحدی)

دکھ انگور کی بیلیں ہیں یہ بیلیں پھلنے دو
سکھ کے پل بھی کھنچ آئیں گے سورج ڈھلنے دو
(خالد احمد)

بیاض میں حسبِ سابق مختلف اصناف کے ساتھ ساتھ خطوط کا سلسلہ بھی خوب ہے جس میں محمد شفیق انصاری، آفتاب احمد ملک اور جناب نسیم سحر نے بڑے تفصیلی خط لکھے ہیں۔

طالب انصاری

برادر مکرم جناب عمران منظور صاحب!

مسنون سلام اور بہت احترام

'بیاض' کا شمارہ بابت جنوری 2022 ہم دست ہوا۔ جذبات تشکر قبول فرمایئے۔

نثری گوشہ میں محمد ارشاد صاحب نے "شہداستان" کے ضمن میں مختلف موضوعات پر جستہ جستہ بہت دل چسپ اور معلومات افزا گفتگو فرمائی۔ اچھی لگی اور پسند آئی۔

قسط وار شائع ہونے والی شوکت علی شاہ کی آپ بیتی سادہ بیانیہ انداز کی معلوماتی تحریر ہے۔ زندگی کے تجربات و مشاہدات بالخصوص سرکاری ملازمت کے دوران پیش آنے والے واقعات کا عمدہ بیان ہے۔ دیگر مضامین بھی موضوعاتی سطح پر قابل مطالعہ تھے۔

سیما پیروز صاحبہ کا افسانہ 'زبیدہ لاج' نہایت دل چسپ اور دل گداز تھا۔ افسانہ ماضی آفرینی کے رنگوں میں بھیگتا ہوا محبت کی کہانی میں بدل جاتا ہے۔ محبت ایسا موضوع ہے، جس پر دنیا بھر کے ادب میں سب سے زیادہ لکھا گیا ہے لیکن اسلوب کی انفرادیت اس پامال موضوع کو بھی جھاڑ پونچھ کر نیا بنا دیتی ہے۔ سیما پیروز نے اس افسانے کی آخری سطروں میں ایسی اداسی بھر دی ہے کہ قاری کافی دیر تک گم صم سا سوچتا رہ جاتا ہے۔

حسبِ سابق 'بیاض' میں شاعری بھی خوب پڑھنے کو ملی۔ یوں تو سب غزلیں اور نظمیں بہت اچھی تھیں، لیکن غزلوں میں مجھے سب سے اچھی غزلیں عزم الحسنین عزمی، راحت سرحدی، اعجاز کنور راجا اور اسحاق وردگ کی لگیں۔

اسحاق وردگ نے ایک لمبی ردیف "مجھے اس طرف کو جانے دے" کو کمال ہنرمندی سے نبھایا اور اچھے اشعار کہے:

پس غبار مجھے اس طرف کو جانے دے
نگاہ دار مجھے اس طرف کو جانے دے
ہے میرا ذوق تجسس کہ اس طرف کیا ہے
بس ایک بار مجھے اس طرف کو جانے دے
(اسحاق وردگ)

نظموں میں رخشندہ نوید، شاہدہ حسن، خاور اعجاز اور جمیل یوسف صاحب نے متاثر کیا۔ جمیل یوسف کی غزل ہو یا نظم تذکرہ دلبروں کا حسین مرقع ہوا کرتی ہے۔ زیر نظر نظم بعنوان "رانی" بھی کسی مخصوص خوب رو پر کہی گئی نظم لگتی ہے۔ نظم بہت دل پذیر اور شاعرانہ ہنرمندی کا شاہکار ہے۔ اختر شیرانی کی محبوباؤں عذرا اور سلمیٰ کی طرح میں تو اس خوب رو کو بھی خوش قسمت کہوں گا۔ ہو سکتا ہے جمیل یوسف کی شاعری میں جلد یا بدیر یہ موصوفہ بھی نام کی حد تک معروف ہو جائے۔ نظم کے ایک شعر میں جمیل یوسف صاحب نے شاعرانہ ہنرمندی سے کام لیتے ہوئے موصوفہ کا اصل نام رفعت بتا دیا ہے۔

میرے فکر و خیال کی رفعت
میرے جذبات کی طہارت ہو

ہو سکتا ہے یہ محض میرا گماں ہو۔ ضروری تو نہیں کہ رانی سے مراد رفعت ہی ہو۔ رقیہ بھی تو ہو سکتا ہے [illegible] ملفوف ہے۔ احباب بیاض کی خدمت میں سلام۔

محمد شفیق انصاری

محترم عمران منظور بھائی صاحب!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ!
اُمید ہے کہ اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے آپ اور 'بیاض' کے سب ارکان بخیرو عافیت ہوں گے۔
نئے سال کا آغاز حیرت انگیز طور پر خوش آئند رہا کہ یکم جنوری 2022 کو جب آنکھ کھلی تو سائیڈ ٹیبل پر 'بیاض' ملا جو کہ ڈاکیا گیارہ بجے دے گیا تھا۔ 'بیاض' کو کھولتے ہی مرشدی خالد احمد صاحب کی دل موہ لینے والی نظم سے آغاز کیا۔ اس کے بعد حصہ حمد میں سب سے پہلی حمد جلیل عالی صاحب کی ہے۔ جس کا یہ خوبصورت شعر:

مثلِ توحید نمو دل میں اذاں سے پائے
روشنیٔ فکر کو دیں نور منارے اُن کے

صفدر صدیق رضی کی حمد سے:

جتنا بہتر ہوں میں اب تک تری توفیق سے ہوں
میں گنہگار تھا اس چال چلن سے پہلے

اشرف کمال کی خوبصورت حمد کا یہ شعر:

میرا سرمایہ ہے حمد و ثنا کے آداب
میرا خالق مجھے لفظوں کا ہنر دیتا ہے

حصہ حمد کے بعد حصہ نعت میں سب سے پہلی نعت آصف ثاقب کی ہے۔ جس کا یہ خوبصورت شعر:

ہم اس ایمان پر قائم ہمیشہ
دوامی ہے محمدؐ کی نبوت

سید ریاض حسین زیدی کی نعت کا یہ شعر:

جائیں جنت کو سب قرینے سے
راستہ مل گیا مدینے سے

خاور اعجاز کی نعت کا یہ خوبصورت شعر:

درخشندہ ہے بزم ہستی انہیؐ سے
یہ عالم صدف اور نگینہ محمدؐ

سید فرخ رضا ترمذی کی نعت سے یہ شعر:

ختم الرسل ہے اب نہ نبی کوئی آئے گا
دنیا میں اب ہے ختم نبوت کی روشنی

رخشندہ نوید کا یہ خوبصورت شعر:

اندھیروں میں جگنو سمیٹے کھڑی ہوں کرم اُن کے ہر سو سمیٹے کھڑی ہوں

مسدس حالی پر خوب صورت تضمین محمد یٰسین قمر نے کی اور حصہ نعت کو مزید شاندار بنا دیا اور الطاف حسین حالی کی مسدس کو لے کر ایک نعت میں ڈھال دیا۔

مرزا آصف رسول کی "شہِ خوباں" سے یہ خوبصورت شعر:

ہے تو وہ سیدِ کونین اے شہِ خوباں! عرب نثار ہے تجھ پر، عجم ہے تجھ پہ فدا

"نعتیہ رباعیات" میں گلزار بخاری کی خوبصورت رباعی:

گر دل میں نہ ہو عشقِ محمدؐ کا ورود کس کام کے ٹھہریں گے رکوع اور سجود

گلزار پڑھو تم بھی فرشتوں کی طرح اللہ بھی پڑھتا ہے محمدؐ پہ درود

اردو ادب میں پنجابی ماہیے کی طرز پہ ہائیکو جاپانی شاعری سے آیا۔ اور ہائیکو نے اردو شعرا کو اپنی جانب متوجہ کیا اور بہت زیادہ شعرا نے ہائیکو پہ طبع آزمائی کی۔ ہائیکو میں نسیم سحر نے جاپانی ہائیکو نگار یوشی میکامی اِنا کے ہائیکوز کا اردو میں انگریزی سے ترجمہ کیا۔ جو پہلے جاپانی سے انگریزی میں ترجمہ ہوئے۔ نسیم سحر کی خوبصورت ترجمہ نگاری:

خود پر شرمندہ!
دھوپ میں محنت کش مصروف
اونگھ رہا ہوں میں

اس کے بعد خاور اعجاز نے بھی Jame Reich hold کی ہائیکوز کو خوبصورت انداز سے اردو قالب میں ڈھالا ہے۔ ہر انسان کی زندگی کی کہانی اللہ نے خود لکھی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ اختیارات انسان کو بھی دے رکھے ہیں یہ تھیم لائن افسانہ "پھولوں کی تازہ مہک" بلقیس ریاض کا ہے۔ اس کے بعد سیما پیروز نے "زبیدہ لاج" کے نام سے ایک ماضی اور حال کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔

شوکت علی شاہ کی آپ بیتی "شاہ داستان" افسر شاہی کی خوبیوں، خامیوں اور حاکمین وقت کی طرزِ حکمرانی سازشوں، ماضی کی سیاست کے پردوں کو چاک کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہے۔

محمود شام نے بلّے صاحب سے اپنی محبتوں اور عقیدت کا اظہار اُن پر ایک مختصر مگر جامع مضمون "سید فخر الدین بلّے ... بلّے بھئی بلّے" لکھ کر کیا۔

"شہداستان" ایک نئے تخلیقی انداز میں مسلم دنیا اور معاشروں کی عکاسی اور پھر موجودہ حالات میں مسلمانوں کی حالت زار اور اُردو کی بطور زبان ہماری تدریس میں اس کا حصہ اور بولنے، لکھنے اور پڑھنے میں اس کے کردار کے حوالے سے ایک جامع بات کی ہے۔ محمد ارشاد نے ایک خوبصورت مضمون تحریر کیا اور اس کا ٹائٹل بھی زبردست ہے۔ "شہداستان"

حامد یزدانی، خورشید ربانی، ہارون الرشید، شاہد اشرف کے مضامین بھی اس شمارہ کی زینت بنے ہیں یوں تو فیض احمد فیض کی شاعری اور زندگی پر بے شمار کام ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔ اور ان پہ لاتعداد کتابیں، مضامین، مقالے لکھے جا چکے ہیں مگر اس شمارہ میں محمد حنیف نے فیض احمد فیض پہ ایک جامع انداز میں مضمون لکھا ہے، جو قاری کو فیض صاحب کی شاعری اور زندگی کے حوالے سے روشناس کراتا ہے۔ جام سجاد حسین کا مضمون "بیٹی" اپنی نوعیت کا ایک اچھا مضمون ہے۔

غزل کی بات کی جائے تو موجودہ دور میں مُرشدی خالد احمد کے ذکر کے بغیر غزل کی تاریخ اُدھوری اور پھیکی رہے گی۔ خالد احمد صاحب کا یہ خوبصورت شعر:

کون اُٹھائے گا ترے بعد تھکن کی گٹھڑی
رُک کے چن لیں مجھے رہگیر یہ تقدیر کہاں

کیوں نہ بخت پر اُسے ناز ہو دلِ آدمی ہے وہ آئینہ
کہ ہے چشمِ لطف سے دیکھتا جسے خود خدا بھی کبھی کبھی
(امجد اسلام امجد)

شاید آ جائے اس کا خط باقی
روز رکھتا ہوں نامہ بر کا خیال
(باقی احمد پوری)

جہاں پہ پیاس ہو، یہ اس طرف نہیں جاتا
عجب ٹیڑھ ہے مجھے نفسیات پانی میں
(اعجاز کنور راجہ)

شاخ سے ٹوٹے پتے ہی بتا سکتے ہیں
ہجر کیا چیز ہے اور اصل میں ہجرت کیا ہے
(ممتاز اطہر)

چاہِ غم میں کبھی جو اترا ہوں
ہوش بالائے بام رہتے ہیں
(رشید آفرین)

دفترِ دہر پڑھ کے دیکھ لیا
تم ہی تم ہو کہیں پہ ہم تو نہیں
(کرامت بخاری)

آئینہ دل اور ستارہ ٹوٹ کر
جڑ نہیں سکتا دوبارہ ٹوٹ کر
(راحت سرحدی)

ٹھہر تو جاؤں سرِ مرگ دو گھڑی میں بھی
مگر جو پیچھے مرے زندگی پڑی ہوئی ہے
(حامد یزدانی)

کچھ نہ کچھ اپنا اثر رکھتی ہے صحبت آخر
وہ جو رہتا ہے حسینوں میں حسیں رہتا ہے
(منظور ثاقب)

ایسی بے باک تھی ادا اُس کی
ہو گئے ہم تو پانی پانی سے
(ممتاز راشد لاہوری)

میں جانتا تھا مرے دوست تو نہیں میرا
ترا مزاج کسی اور سے ملا ہوا تھا
(اقبال سروبہ)

یاں تو محتاجِ تصور ہے یقیں
ساکنِ وہم و گماں سوچنا کیا
(حسنین سحر)

برائے لذتِ کام و دہن زمانے میں
بنامِ عشق فقط ایک جام کافی ہے
(ارشد شاہین)

دل بے بصر ہے، ذہن پہ چھائی ہے تیرگی
مدت سے آگہی کا نگر بے چراغ ہے
(شہاب صفدر)

اگر آسودگی اپنا بسیرا جاوداں کر لے
مصیبت خود پہ کوئی ناگہانی ڈال لیتا ہوں
(تصدق شعار)

تجھ کو چھونا تو اضافی تھا مرے پھول بدن
تری خوشبو سے، پسینے سے تجھے جانتا ہوں
(افتخار شاہد)

اب تک تو تجھے ۔ دل سے اتارا نہیں میں نے
اب تک میں ترا، ہجر منانے میں لگی ہوں
(زیب النساء زیبی)

غزل کی شاخ پہ اشکوں کا بور آتا ہے
نکالتا ہے جب اپنی بھڑاس میرا دل
(عزیز فیصل)

بچوں نے اس کو مارے ہیں کس لیے پتھر
اُس کا تو آج چاک گریبان بھی نہیں
(زبیر فاروق)

تجھ تجھ تھا محبت میں مری کھوٹ نہ تھا
چاہے چنچل تھا کلائی کے کڑے تیتی تھے
(عاطف جاوید عاطف)

ہزار میری طلب میری جستجو روئے
مگر یہ اب بھی گوارا نہیں کہ تو روئے
(اکرم جاذب)

زبورِ وقت کے سونپ آئے عجلت میں
مجھے سنبھال ذرا دیر اضطراب مرے
(نعیم رضا بھٹی)

ہر اک سے ہمکلام ہوئے خود کو چھوڑ کر
سب سے اہم تھا کام جو ہم نے نہیں کیا
(عطاءالعزیز)

شور اٹھا خوطہ خور ڈوب گئے
گویا دستِ ہنر پہ وار ہوا
(احمد محسود)

کچھ تو تفصیل ہو کہانی کی
جانے کیوں اختصار پہلا سا
(طلعت شبیر)

دل پہ چوٹ کا حاصل بھی
بس اک پیار جتانے تک
(آسناتھ کنول)

وہ تیرگی میں ڈھونڈ ہی لیتی ہے راستہ
مہتاب کی طرح جو منور ہے زندگی
(سہیل یار)

فقیروں کی قبا بھی ہے بگولہ
بگولہ بھی غبارا ہے زمیں کا
(سرفراز تبسم)

سب کو یہاں پہ خوف اندھیروں کا ہے مگر
میں روشنی سے ہارا ہوں اس مات کا ہے خوف
(قلیل قمر)

خدا کے بارے میں بُت پرستوں سے بات کی تو
کبھی تو عُزّیٰ ، کبھی وہ لات و منات سمجھے
(محمود کیفی)

تمہاری آنکھ کا نشہ دماغ سے گیا نہیں
گھرا ہوا ہوں آج تک خمار بے شمار میں
(صائم شیرازی)

فقیر وجد میں کانٹوں پہ رقص کرنے لگا
تو دھول ہو کے کبھی خار و سنگ اڑنے لگے
(رمیض نقوی)

ابھی تو وقت کو تاوان دے کے بیٹھا ہوں
ابھی حیات مرا ساتھ کیسے چھوڑے گی
(نوید صادق)

'بیاض' میں شاہد ماکلی نے 'شاعرِ امروز' کے نام سے ایک اچھا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اس شمارے میں شاعرِ امروز ماریہ مجور اور احمد رضا ہیں جو کہ دونوں نوجوان ہیں اور ان کی کتابوں سے منتخب اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مستقبل کے خوبصورت شاعر بن کر اُبھریں گے۔

اعجاز رضوی صاحب ایک خوبصورت اور سینئر شاعر ہیں اور 'بیاض' کی مجلسِ ادارت کے اہم اور سرکردہ رُکن ہیں۔ اُن کا علی اصغر عباس کی شخصیت پہ ایک خوبصورت خاکہ 'پیاس ہی پیاس' کے نام سے جو انھوں نے اکادمی ادبیات کی تقریب میں پڑھا اس شمارے کی زینت ہے۔ اس خاکہ میں انھوں نے جہاں علی اصغر عباس کی شخصیت کا تعارف ہلکے پھلکے انداز میں کروایا وہیں محمد جمیل اکادمی والے دوست کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

'شاعری بھی عجیب مشغلہ ہے' امجد اسلام امجد کی خوبصورت اور دل موہ لینے والی نظم سے 'بیاض' کے گوشۂ نظم سے آغاز ہوتا ہے۔ غضنفر صدیق رضی کی نظمیں، شاہدہ حسن کی 'حمدیہ نظم' خالد علیم کی 'میراجی کے نام' حامد یزدانی کی 'خود۔ جزیرہ دات کا آخری مشورہ' اسلام عظمی کی 'صحرا شاموں میں اک شام' فرحت عباس شاہ کی 'تھہ دم' خالب انصاری کی 'آخری گزارش' اور وسیم جبران کی 'اعتراف' شاندار نظمیں ہیں۔

کرامت بخاری صاحب کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے کہ وہ 'بیاض' سے پہلے شمارے سے لے کر اب تک اس 29 سالہ سفر میں ہر شمارہ میں موجود رہے۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ اللہ پاک انھیں سلامت رکھے۔ آمین

والسلام

رانا محمد شاہد

محترم عمران منظور، اعجاز رضوی صاحب

السلام علیکم!

نئے سال کی مناسبت سے جھاڑیوں سے نکلتا سورج اُمید کی ایک روشنی کی مانند تھا۔ ہمیں اچھے دنوں کی اُمید ترک نہیں کرنی چاہیے۔ واصف علی واصف کا ایک قول یاد آ رہا ہے۔ ''کشتی ہچکولے کھا رہی ہو تو اللہ کی رحمت کو پکارا جاتا ہے۔ جب کشتی کنارے لگ جائے تو اپنی قوت بازو کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ بہت کم انسان ایسے ہیں جو اپنے حاصل کو رحمت پروردگار کی سمجھتے ہیں۔ بہرحال، حال کے بدحال ہونے کے باوجود مستقبل کے خوشحال ہونے کی اُمید ترک نہیں کرنی چاہیے۔'' ابتدائی صفحہ پر خالد احمد کی دستک نظم اچھی لگی۔ اس دفعہ دو ہی افسانے تھے۔ بلقیس ریاض اور سیما پیروز کے دونوں افسانے خوب تھے۔ مضامین میں محمود شام صاحب کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ان کا شمار ہمارے صحافتی حلقے کے اولین شہسواروں میں ہوتا ہے۔ شام صاحب سے رابطہ رہتا ہے۔ سید فخر الدین بلے پر ان کی خوبصورت تحریر پڑھنے کو ملی۔ محمد ارشاد کا سرمید کی خدمات اور اردو زبان کی تاریخ کو اُجاگر کرتا ہوا مضمون پسند آیا۔ ہم نے تو یہی پڑھا تھا کہ برصغیر میں اردو کو علمی زبان بنانے کی بنیاد ایک انگریز جان گلکرسٹ نے رکھی۔ جبکہ مضمون میں جان گلکرائسٹ نام درج ہے۔ حامد یزدانی اور خورشید ربانی نے لیاقت علی عاصم اور قاضی محمد عمر خان المعروف قضا روحی کی شاعری کے حوالے سے خوبصورت تحریریں لکھیں۔

جام سجاد حسین نے بیٹی کی محبت اور سماجی رویوں کے حوالے سے زبردست تحریر لکھی۔ ان کی تحریر کے ابتدائی پیراگراف پڑھتے ہوئے اپنی بیٹی کی ابتدائی سالوں کی حرکتیں یاد آتی رہیں۔ جب وہ خاموشی سے غائب ہو جاتی اور جب تلاش کیا جاتا تو معلوم ہوتا کہ یہ حرکت مٹی کھانے کے لیے کی گئی تھی۔ جام صاحب کا نام پڑھتے ہوئے ان کی بچوں کے لیے لکھی وہ کہانی یاد آ جاتی ہے جو 27 سال پہلے بچوں کے ایک معروف میگزین میں شائع ہوئی تھی۔ علی اصغر عباس کی شخصیت پر اعجاز رضوی نے طنز و مزاح سے بھرپور خوبصورت خاکہ تحریر کیا۔

نظموں میں امجد اسلام امجد کی ''شاعری بھی عجیب پھل ہے'' خاور اعجاز کی کچھ دیر ٹھہر، شاہدہ حسن کی حمدیہ نظم، رخشندہ نوید کی 'دھوپ سے دھوپ تک' اور طالب انصاری کی 'آخری گزارش' پسند آئیں۔

جنوری کے پہلے ہفتے بورے والا کی معروف علمی و ادبی شخصیت اے غفار پاشا انتقال کر گئے۔ نومبر میں پاشا صاحب کی طبیعت ناسازی کا ذکر 'بیاض' میں کیا تھا، جب دوستوں کے ساتھ ان کی عیادت کے لیے گیا۔ دسمبر میں سید ناصر ہاشمی کہہ رہے تھے کہ آپ کے 'بیاض' میں چھپے خط سے معلوم ہوا کہ پاشا صاحب بیمار ہیں اور پھر اُن کی عیادت کے لیے گئے۔ گزشتہ دنوں پوسٹ آفس میں ہاشمی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے پاشا صاحب کی یاد میں لکھا اپنا قطعہ سنایا جو نذر قارئین ہے:

اور افسوس کروں میں کیسے
منہ وہ ہم سے موڑ گئے ہیں
پاشا صاحب روٹھ گئے پر
ایک کہانی چھوڑ گئے ہیں

والسلام

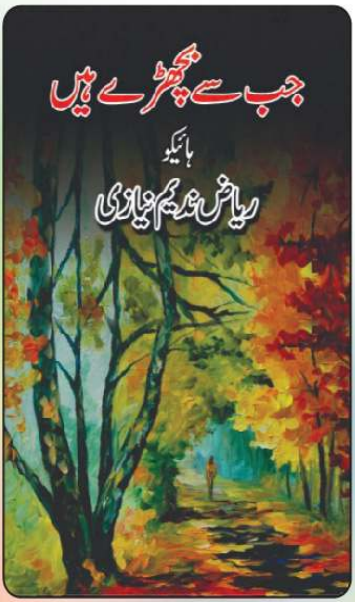
جب سے بچھڑے ہیں
ہائیکو
ریاض ندیم نیازی

پلکیں بھیگنے لگتی ہیں
خالق آرزو

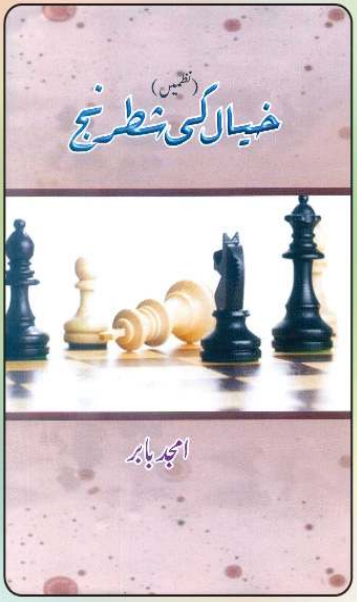
(نظمیں)
خیال کسی شطرنج
امجد بابر

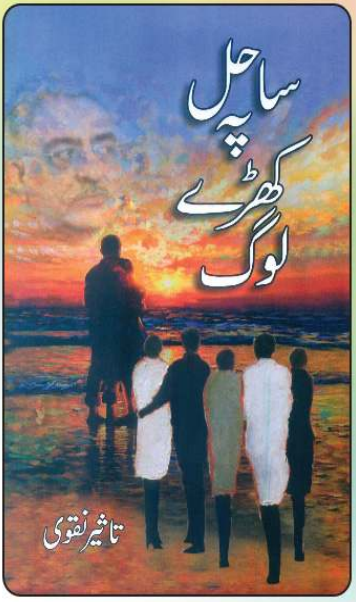
ساحل پہ کھڑے لوگ
تاثیر نقوی

۱۵ دسمبر ۱۹۸۵ء کینیڈین اسکالر ڈاکٹر تسلیم الٰہی زلفی کی لاہور آمد پر ان کے اعزاز میں منعقد ایک یادگار تقریب میں اسلم کمال، حسن رضوی، ڈاکٹر تسلیم الٰہی زلفی، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر اجمل نیازی، نجیب احمد اور خالد احمد تشریف فرما ہیں۔

عمران منظور (کینیڈا میں) جناب حامد یزدانی کو کلیاتِ خالد احمد پیش کرتے ہوئے۔

عمران منظور (کینیڈا میں) جناب ڈاکٹر تسلیم الٰہی زلفی کو کلیاتِ خالد احمد پیش کرتے ہوئے۔